Acc No 362
Al/3
1/61
GOVT COLLEGE SRINAGAR
ACC. NO 4786
LIBRARY

دھواں

سعادت حسن منٹو

کے

چوبیس ۲۴ افسانوں کا مجموعہ

SAQ. BOOK DEPOT.
Rs 3/-
DELHI.

طبع چہارم سنہ ۱۹۵۳ء قیمت تین روپے آٹھ آنے

Rs 3/8/-

نوٹ

جس کتاب پر مالک ساقی بکڈپو دہلی کے دستخط نہ ہوں گے۔ وہ مال مسروقہ سمجھا جائیگا۔

(جملہ حقوق بحق ساقی بک ڈپو محفوظ ہیں)

ناشر

ایم۔ آزاد مرزا۔ مالک ساقی بکڈپو دہلی

8.263
M31D

حسن عبّاس کے نام

"تو پھر کیا ہوا؟"

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگرم میرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لمحے کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا" پھر کیا ہونا تھا، میں نے تو ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا، میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا!"

"گرم تھا...... اچھا مسعود یہ بتاؤ کہ تم میرا ایک کام کرو گے؟"

"بتائیے؟"

"آؤ میرے ساتھ آؤ۔"

"نہیں آپ پہلے بتائیے۔ کام کیا ہے؟"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ؟"

"جی نہیں ——— آپ پہلے کام بتائیے۔"

"دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔ میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا ——— اچھے بھائی جو ہوتے۔ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنی شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو درد ہو رہا ہے، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھ ہی سے ہیں، کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔" مسعود اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیے، لیکن یہ آپ سے کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔"

"شاباش۔ شاباش!" اس کی بہن اُٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق پر رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی

طرف دیکھا: مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے "مسعود آج ضرور بارش ہو گی" یہ کہہ کر اُس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا" دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا"۔

"بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ ادھر میرے پلنگ پر آ کر جلدی جلدی کمر دباؤ ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی" کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔ مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دابنا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دوکان میں اپنی انگلیوں سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لئے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر، وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل نہ تھا

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اُس نے بڑی بد دلی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھنچی بھنچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اُس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے۔ مگر مسعود اپنی کلثوم کی کمر دباتا رہا جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ اور کہنے لگی شاباش مسعود شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح ——— شاباش میرے بھائی۔"

مسعود نے دیوار کا سہارا لیکر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دوہری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا، لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ سی منجمد سی ہو گئی۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لیکر اپنی بہن کی رانیں دبائے، چنانچہ اس نے کہا۔ "یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جائیے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی رانوں کی مچھلیاں اِدھر اُدھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی اسکا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔ "نا بھائی میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم اوٹ پٹانگ طریقے سے دباتے ہو۔"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ "نہیں۔ اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا ——— آپ اطمینان رکھیے۔ اب ایسے اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

دیوار کا سہارا لیکر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے اپنے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر اِدھر اُدھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اسی طرح پھسلتا ہو گا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو اسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اُسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا کلثوم کو اگر ذبح کر دیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟" لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

"بس بس"، کلثوم تھک گئی "بس بس"۔

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اُترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی کرنا شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے لیکن جب اس نے ارادہ کر کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کئے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور تازہ بہ کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں

جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا۔ جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا پھر بھی ایک گمنام سا مزہ اس سوچ بچار میں اسے آرہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور اُن کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہونچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لئے وہ باورچی خانہ میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا، ابھی اس نے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اُٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی تالاب کے پانی کی طرح یہ اُوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہونچے۔

دیر تک وہ ایسی ہی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی دُکھن پیدا ہو گئی اور ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزا آیا۔ اس کے جسم کے کسی حصہ میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی۔ اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہ تھا۔ البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانہ سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا۔ نہ کوئی باورچی خانہ میں تھا اور نہ صحن میں۔ اِدھر اُدھر

جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے بارش اب رُک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی "یہ کون ہے؟"

"جی میں ۔۔۔ مسعود!"

اندر سے آواز آئی "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"جی کھیل رہا ہوں"

"کھیلو ......" تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا: "تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے شور نہ مچانا"

یہ سنکر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم وا ۔۔۔ مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں، خوف زدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عُریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا، اس کے دماغ میں دُھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے اُلٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اُسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا۔

اور زیادہ زور لگانے پر ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائیگا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں تو خم پیدا کر لیا۔ مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب وہ تھک کر ہار گیا تو جھنجلا کر اُس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

کبوتروں والا سائیں

پنجاب کے ایک سرد دیہات کے تکیئے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کھدے ہوئے گڑھے میں بڑے بڑے اپلوں سے آگ سلگا رہی تھی۔ صبح کے سرد اور مٹیالے دھندلکے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھوں کو سکیڑ کر اور اپنی کمر کو دوہرا کر کے منہ قریب قریب زمین کے ساتھ لگا کر اوپر تلے رکھے ہوئے اپلوں کے اندر پھونک گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے تھوڑی سی راکھ اڑتی ہے اور اس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آگئی ہے۔

اپلوں کے اندر آگ سلگتی ہے اور یوں جو تھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے، مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر جھریوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔

مائی جیواں یہ آگ کئی مرتبہ سلگا چکی ہے۔ یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اس کے پردادا نے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے، ایک زمانے سے ان کے قبضہ میں تھی۔ گاما سائیں کے مرنے کے بعد اب اس کی ہوشیار بیوی اکیلی تکیئے کی مجاور تھی۔ گاما سائیں سارے گاؤں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ ذات کا وہ کمہار تھا مگر چونکہ اسے تکیئے کی دیکھ بھال کر

ہوتی تھی۔ اس لئے اُس نے برتن بنانے چھوڑ دیئے تھے۔ لیکن اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں۔ بھنگ گھوٹنے کے لئے وہ سال بھر میں چھ کونڈیاں بنایا کرتا تھا۔ جن کے متعلق بڑے فخر سے وہ یہ کہا کرتا تھا کہ چوہدری لوہا ہے لوہا —— فولاد کی کونڈی ٹوٹ جائے پر گاما سائیں کی یہ کونڈی دادا لے تو اس کا پوتا بھی بھنگ گھوٹ کر پیئے گا۔

مرنے سے پہلے گاما سائیں چھ کونڈیاں بنا کر رکھ گیا تھا جو اب مائی جیواں بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔

گاؤں کے اکثر بڈھے اور جوان تکیے میں جمع ہوتے تھے اور سردائی پیا کرتے تھے گھوٹنے کے لئے گاما سائیں نہیں تھا پر اس کے بہت سے چیلے چانٹے جو اب سر اور مونچھیں منڈا کر سائیں بن گئے تھے، اس کی بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے اور مائی جیواں کی سلگائی ہوئی آگ سلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔

صبح اور شام تو خیر کافی رونق رہتی تھی مگر دوپہر کو آٹھ دس آدمی مائی جیواں کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے۔ اِدھر اُدھر کونے میں لمبی لمبی بیل کے ساتھ ساتھ کئی کابک تھے جن میں گاما سائیں کے ایک بہت پرانے دوست اللو پہلوان نے سفید کبوتر پال رکھے تھے۔ تکیے کی دھوئیں بھری فضا میں ان ان سفید اور چتکبرے کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ بہت بھلی سی معلوم ہوتی تھی جس طرح تکیے میں آنے والے لوگ شکل و صورت سے معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے۔ اسی طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیواں کے بڑے لڑکے نے جھانجھ پہنا رکھے تھے بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔

مائی جیواں کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبدالغفار تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانیدار کا تھا جو کبھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کے موقعہ دیکھنے کے لئے گاؤں میں آیا کرتا تھا اور گاما سائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی جب وہ گیارہ برس کا تھا

تو مائی جیواں اس کے نام میں تھانیداری کی بو سونگھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی۔ خاصا تگڑا جوان تھا پتہ نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برس میں ہی سچ مچ کا سائیں بن گیا۔ یعنی ناک سے رینٹھ بہنے لگا اور چپ چپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور منہ سے ہر وقت لعاب سا نکلنے لگا۔ پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دیں ہیں اور اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اُسے ڈھارس ہوئی کہ چلو یوں بھی تو کما ہی لے گا۔ کمانا دمانا کیا تھا۔ عبدالغفار جس کو اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے، گاؤں میں پھر پھرا کر آٹا چاول اکٹھا کر لیا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ اس کی ماں نے اس کے گلے میں ایک جھولی لٹکا دی تھی جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ کبوتروں والا سائیں اُسے اس لئے کہا جاتا تھا کہ اسے کبوتروں سے بہت پیار تھا۔ تکیے میں جتنے کبوتر تھے ان کی دیکھ بھال ابو پہلوان سے زیادہ یہی کیا کرتا تھا۔

اسوقت وہ سامنے کوٹھڑی میں ایک ٹوٹی کھاٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ باہر اس کی ماں آگ سلگا رہی تھی ——!

چونکہ سردیاں اپنے جوبن پر تھیں، اس لئے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے۔ مگر تکیہ جو کہ گاؤں سے فاصلہ پر تھا ابھی تک آباد نہ ہوا تھا۔ البتہ دُور کونے میں مائی جیواں کی بکری زور زور سے ممیا رہی تھی۔

مائی جیواں آگ سلگا کر بکری کے لئے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو اُسے ایک اجنبی سر پہ ٹھاٹا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا۔ پگڑی کے ایک پلو سے اس آدمی نے اپنا چہرا آنکھوں تک چھپایا

رکھا تھا جب اُس نے موٹی آواز میں "مائی جیواں السلام علیکم" کہا تو پگڑی کا کھردرا کپڑا اس کے منہ پر تین چار مرتبہ سُکڑا اور پھیلا۔

مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کئے بغیر کہا "علیکم السلام۔ آؤ بھائی بیٹھو۔ آگ تاپو۔

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھ کر اس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سلگتی رہتی تھی۔ اجنبی اور وہ دونوں پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اس آدمی نے مائی جیواں سے کہا "ماں۔ اللہ بخشے گا سائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا۔ اس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے صدمہ ہوا۔ مجھے آسیب ہو گیا تھا، قبرستان کا جن ایسا چمٹا تھا کہ اللہ کی پناہ۔ گاما سائیں کے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دُور ہو گئی۔"

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر آتا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا "میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں، ایک خاص بات کہنے کے لئے" اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں سُن رہا اور بھینچے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا: "میں سُندر ڈاکو کے گروہ کا آدمی ہوں۔ پرسوں رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ مارنے والے ہیں۔ خون خرابہ ہو گا۔ اس لئے میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو دُور ہی رکھنا۔ میں نے سُنا ہے کہ گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ جوان آدمیوں کا لہو ہے بابا، ایسا نہ ہو کہ جوش مار اٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ تم اُن کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو تو ٹھیک رہے گا۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ السلام علیکم۔"

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاؤ پر زور زور سے مل کر اُٹھا اور جس

راستے سے آیا تھا اُسی راستے سے باہر چلا گیا۔

سندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا۔ اُس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اُسی کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ بے شمار گیت اُس کی بہادری اور دلیری کی گیے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے۔ اس کا نام سُن کر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔ سُندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو ہر شخص اس سے اپنی اچانک مُلاقات کے من گھڑت قصے سُنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا۔ اس کے قدوقامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قدآور جوان ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والا۔ ان مونچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ بڑے بڑے لیموں ان کی مدد سے اٹھا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے مگر بدن اسقدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہوگا۔ بہرحال سب متفقہ طور پہ اس کی طاقت اور بے باکی کے معترف تھے۔

جب مائی جیواں نے یہ سُنا کہ سُندر جاٹ ان کے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آرہا ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبی کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اس کا شکریہ بھی ادا کر سکی مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سُندر جاٹ کا ڈاکہ معنی رکھتا ہے پچھلی دفعہ جب اس نے ساتھ والے گاؤں پر حملہ کیا تھا تو سکھی مہاجن کی ساری جمع پونجی غائب ہو گئی تھی اور گاؤں کی سب سے سندر اور چنچل چھوکری ایسی گم ہوئی تھی کہ اب تک اس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ یہ بلا اب ان کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیواں کے گاؤں کسی اور کو نہ تھا۔ مائی جیواں نے سوچا کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے۔ چوہدری کے گھر خبر کر دے۔ لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے

پچھلے دنوں اس نے تھوڑا سا ساگ مانگا تھا تو انہوں نے انکار کر دیا تھا
گھسیٹا رام حلوائی کو ۔ تنبیہ کر دے .... نہیں ، وہ بھی ۔ ٹھیک
آدمی نہ تھا۔

وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی ۔ گاؤں کے سارے آدمی وہ
ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس
نے مہربانی کے قابل نہ سمجھا ۔ اس کے علاوہ اس نے سوچا اگر اس نے کسی
کو ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پر مہربانی کریگا
اور یوں تو سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائیگا جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا ۔ آخر
میں وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ ، کی ،
غلاف چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی ۔ اور رحمان کو پاس والے گاؤں
میں بھیجدے گی ۔

جب وہ سامنے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اسے عبدالغفار
یعنی کبوتروں والا سائیں کھڑا نظر آیا ۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنسا ۔ اس کی یہ ہنسی
آج خلاف معمول معنی خیز تھی ۔ مائی جیواں کو اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور
متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوشمندی کی نشانی ہے ۔

جب وہ کوٹھڑی کے اندر جانے لگی تو عبدالغفار نے پوچھا " ماں ، یہ
صبح سویرے کون آدمی آیا تھا ؟ "

عبدالغفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا ، اس لئے اس کی
ماں جواب دیئے بغیر اندر چلی گئی ۔ اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی " اے
رحمان ، اے رحمان اٹھ اٹھ "

بار دو جھنجوڑ کر مائی جیواں نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور وہ
جب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش آگیا تو اس کی ماں نے اس کو
ساری بات سنادی ۔ رحمان کے اوسان خطا ہو گئے ۔ وہ بہت ڈرپوک تھا ۔ گو اکی

عمر اس وقت بائیس ۲۲ سال کی تھی اور کافی طاقتور جوان تھا۔ مگر اس میں ہمت اور شجاعت نام تک کو نہ تھی۔ سُندر جاٹ! — اتنا بڑا ڈاکو جس کے متعلق، مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا پورے بیس ۲۰ گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کے لئے آ رہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا بلکہ یوں کہیئے کہ وہ اسی وقت گاؤں کے چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

رحمان کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی جو کہ گاؤں کی ایک بیباک اور شوخ چنچل لڑکی تھی۔ گاؤں کے سب جوان لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی — بڑے بڑے ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اڑا دیتی تھی۔ چوہدری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دُور دُور سے اس کو نیچا دکھانے کے لئے آئے تھے مگر اس کی کلائی کسی سے بھی نہ مڑی تھی وہ گاؤں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا مگر اس کی یہ ساری اکڑ فوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی جب اس نے وہاں کے کھیت میں اس سے کہا: "مجھے، گنڈا سنگھ، کی کلائی مروڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلہ میں کوئی آدمی ہی نہیں رہا — آ میرے سامنے بیٹھ، میری کلائی پکڑ، ان دو ۲ انگلیوں کی ایک ہی ٹھمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ چھڑا دوں تو نیتی نام نہیں"

فضل دین اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اسے یقین تھا۔ کہ اس کی طاقت اور شہ زوری کے رعب اور دبدبے میں آ کر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائے گی۔ لیکن جب اس نے کئی آدمیوں کے سامنے اس کو مقابلے کی دعوت دی تو وہ پسینہ پسینہ ہو گیا اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر چڑھ جاتی ہے اور وہ اگر اس کی دعوت قبول

کرتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے۔ عورت ذات سے مقابلہ کرتے تو شرم تو نہیں آئی مرد کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے نیتی کی دعوت قبول کرلی تھی۔ اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اس نے جب نیتی کی گدرائی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا۔ نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں دھنس گئیں، ایک نعرہ بلند ہوا اور نیتی کی کلائی فضل کی گرفت سے آزاد ہوگئی .... اس دن سے لے کر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی۔

ہاں تو رحمان کو اس نیتی سے محبت تھی، جیسا کہ وہ آپ کو ڈرپوک تھا۔ اسی طرح اس کا پریم بھی ڈرپوک تھا۔ دور سے دیکھ کر وہ اپنے دل کی، ہوس پوری کیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی اس کے پاس ہوتی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ چھوکرا جو درختوں کے تنوں کے ساتھ پیٹھ ٹیکے کھڑا رہتا ہے اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ اس کے عشق میں کون گرفتار نہ تھا؟ سب اُس سے محبت کرتے تھے اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیر پکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناؤ کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ محبت کرنے کی خواہش البتہ اس کے دل میں اس قدر موجود تھی کہ بالکل اس شرابی کے مانند معلوم ہوتی تھی۔ جس کے متعلق ڈر رہا کرتا ہے کہ اب گرا اور اب گرا ـــــ وہ بے خبری کے عالم میں ایک بہت اونچی چٹان کی چوٹی پر پہنچ چکی تھی۔ اور اب تمام گاؤں والے اُس کی افتاد کے منتظر تھے جو کہ یقینی تھی ـــــ

رحمان کو بھی اس افتاد کا یقین تھا۔ مگر اس کا ڈرپوک دل ہمیشہ اسے ڈھارس

دیا کرتا تھا کہ نہیں، نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔

جب رحمان دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہونچنے کے لئے تیار ہو کر تکیے سے باہر نکلا تو اسے راستے میں نیتی کا خیال آیا مگر اس وقت اس نے یہ نہ سوچا کہ سندر جاٹ دھاوا بولنے والا ہے وہ دراصل نیتی کے تصور میں اس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے پیار محبت کر رہا تھا کہ اسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا۔ البتہ جب وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا تو ایکا ایکی اس نے سوچا کہ نیتی کو بتا دینا چاہیے تھا کہ سندر جاٹ آرہا ہے۔ لیکن اب واپس کون جاتا۔

عبدالغفار یعنی والا سائیں تکیے سے باہر نکلا۔ اس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا تکیے سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گزار دیتا تھا شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو ان کے چلنے سے جو دھول اڑتی ہے اس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آجاتی تھی۔ گاؤں اس کو پسند نہیں تھا۔ اُجاڑ اور سنسان جگہوں سے اُسے غیر محسوس طور پر محبت تھی۔ یہاں بھی لوگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اُس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کیلئے دعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے، نوجوان چھوکریاں بھی چپکے چپکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ ان کے "ماہیا" کا دل کیسا ہے۔ عبدالغفار ان سوالوں کو اوٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا اس لئے کہ اُسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں، لیکن لوگ جو اس کے

پاس سوال لے کر آتے تھے اس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔

عبدالغفار مختلف کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اس کنوئیں کے پاس پہونچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بیکار پڑا تھا۔ اس کنوئیں کی حالت بہت ابتر تھی۔ اُس بوڑھے برگد کے پتے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا اس قدر جمع ہو گئے تھے کہ اب پانی نظر ہی نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی مکڑیوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا بُن دیا ہے اس کنوئیں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر عبدالغفار بیٹھ گیا اور دوسروں کی اداس فضا میں اُس نے اپنے وجود سے اور بھی اُداسی پیدا کر دی۔

دفعتاً اُڑتی ہوئی چیلوں کی اداس چیخوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اُٹھی اور بوڑھے برگد کی شاخوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔ نیتی گا رہی تھی ۔

ماہیا مرے نے باگ لوایا   چمپا، مروا خوب کھلایا

اسی نے لوایاں کھٹیاں دے

راتی سونڑ نہیں دیندیاں اکھیاں دے

اس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے، اس میں ہر طرح کے پھول اُگائے ہیں چمپا، مروا وغیرہ کھلائی ہیں اور ہم لے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں۔ رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں۔ کتنی انکساری برتی گئی ہے۔ معشوق عاشق کے لگائے ہوئے باغ کی تعریف کرتا ہے، لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے جس میں حقیر نارنگیاں لگی ہیں۔ اور پھر شب خوابی کا گلہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

گو عبدالغفار میں جذبات نازک بالکل نہیں تھے   پھر بھی نیتی، کی

جوان آواز نے اس کو چونکا دیا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ نیتی کی آواز ہے۔

گاتی گاتی نیتی کنویں کی طرف آنکلی۔ غفار کو دیکھ کر وہ دوڑی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی "او غفار سائیں...... تم...... او مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں...... اور اسوقت یہاں تمہارے اور میرے سوا، اور کوئی بھی نہیں...... دیکھو میں تمہارا منہ میٹھا کراؤں گی اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھ لی اور...... لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو...... اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا تھوڑی رہتا ہے؟"

وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے میلے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ خلافِ معمول کبوتروں والا سائیں مسکرایا مگر نیتی اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ اس کی نگاہیں گاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں کھردرے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس نے گردن اٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا "غفار سائیں تم اللہ میاں سے محبت کرتے ہو اور میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں۔ تم میرے دل کا حال سمجھ گئے!...... اللہ میاں کی محبت اور اس کے بندے کی محبت ایک جیسی تو ہو نہیں سکتی —— کیوں غفار سائیں...... ارے تم بولتے کیوں نہیں...... کچھ تو بولو —— کچھ کہو...... اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی...... تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں...... تم سُنتے سُنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی...... یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی۔ اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھ گئی۔ اپنے من میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اُس نے ایکا ایکی عبدالغفار سے پوچھا "سائیں، میں کب تھکوں گی؟"

عبدالغفار کے مُنہ سے لعاب نکلنا بند ہو گیا۔ اس نے کنویں کے اندر، جھک کر دیکھتے ہوئے کہا "بہت جلد"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر نیتی نے اس کے کُرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا "کب؟—کب؟——سائیں کب؟"

عبدالغفار نے اِس کا کوئی جواب نہ دیا اور ببول کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ نیتی کچھ دیر کنویں کے پاس سوچتی رہی پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا ادھر چل دی!

وہ رات جس میں سُندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے آرہا تھا مائی جیواں نے آنکھوں میں کاٹی۔ ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ رحمان کو اس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا۔ ابو پہلوان کبھی کبھی تکیے میں آگ، تاپتا تاپتا وہیں الاؤ کے پاس سو جایا کرتا تھا مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیواں ہی نے کھلایا تھا۔

تکیہ گاؤں کے اس سرے پر واقع تھا جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے۔ مائی جیواں ساری رات جاگتی رہی مگر اُس کو ہلکی سی آہٹ بھی نہ سنائی دی۔ جب رات گذر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ سُندر جاٹ کی بابت سوچتی سوچتی سو گئی چونکہ رات کو وہ بالکل نہ سوئی تھی اس لئے صبح بہت دیر کے بعد جاگی۔ کوٹھڑی سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ ابو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تکیے میں پھیلی ہوئی ہے اس نے باہر نکلتے ہی اس سے کہا "ساری رات مجھے نیند نہیں آئی یہ موا بڑا بابا بڑا تنگ کر رہا ہے صبح سوئی ہوں اور اب اٹھی ہوں...... ہاں تم سناؤ کل کہاں رہے؟"

ابو نے جواب دیا "گاؤں میں"

اس پر مائی جیواں نے کہا "کوئی تازہ خبر سناؤ"

انّو نے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر اور جھپٹ کر ایک کبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا۔ آج صبح چوپال پر نتھا سنگھ کہہ رہا تھا کہ گامے چمار کی وہ لونڈیا...... کیا نام ہے اس کا ہاں وہ نیتی کہیں بھاگ گئی ہے؟ ــــ ہیں تو کہتا ہوں اچھا ہوا...... حرام زادی نے سارا گاؤں سر پر اٹھا رکھا تھا"

"کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اٹھا کر لے گیا ہے؟"

"جانے میری بلا...... لیکن میرے خیال میں تو وہ خود ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے"

مائی جیواں کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا۔ سُندر جاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا پر ایک چھوکری تو غائب ہو گئی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیتی کا غائب ہو جانا سُندر جاٹ سے متعلق ہو جائے چنانچہ وہ تمام لوگوں سے نیتی کے بارے میں پوچھتی رہی جو کہ تکیے میں آتے جاتے رہے لیکن جو کچھ انّو نے بتایا تھا اس سے زیادہ اسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔

شام کو رحمان لوٹ آیا اس نے آتے ہی ماں سے سُندر جاٹ کے ڈاکے کے متعلق پوچھا اس پر مائی جیواں نے کہا "سُندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹا نیتی کہیں غائب ہو گئی ہے ــــ ایسی کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا"

رحمان کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں وسق کوس اور چلنے کی تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر زرد تھا۔

ایک دم یہ تبدیلی دیکھ کر مائی جیواں نے تشویشناک لہجہ میں اس سے پوچھا "کیا ہوا بیٹا"

رحمان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا "کچھ نہیں ماں...... تھک گیا ہوں"

"اور منیتی کل مجھ سے پوچھتی تھی، میں کب تھکوں گی؟"

رحمان نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا لعاب پونچھ رہا تھا۔ رحمان نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا کیا کہا تھا اس نے تجھ سے"

عبدالغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا "کہتی تھی کہ میں تھکتی ہی نہیں...... پر اب وہ تھک جائے گی"

رحمان نے تیزی سے پوچھا "کیسے؟"

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی "مجھے کیا معلوم؟...... شمشیر جاٹ جانے اور وہ جانے"

یہ سن کر رحمان کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھا گئی اور مائی جیواں کی جھریاں زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔

اُلّو کا پٹھا

قاسم صبح سات بجے لحاف سے باہر نکلا اور غسل خانے کی طرف چلا راستے میں، یہ اس کو ٹھیک طور پر معلوم نہیں، سونے والے کمرے میں، صحن میں یا غسل خانے کے اندر اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی کو اُلّو کا پٹھا کہے۔ بس صرف ایک بار غصے میں یا طنزیہ انداز میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کہہ دے۔

قاسم کے دل میں اس سے پہلے کئی بار بڑی انوکھی خواہش پیدا ہو چکی تھیں مگر یہ خواہش سب سے نرالی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ رات کو اسکو بڑی پیار کی نیند آئی تھی۔ وہ خود کو بہت ترو تازہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن پھر یہ خواہش کیسے اس کے دل میں داخل ہو گئی۔ دانت صاف کرتے وقت اُس نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جس کے باعث اس کے مسوڑے چھل گئے۔ در اصل وہ سوچتا رہا کہ یہ عجیب و غریب خواہش کیوں پیدا ہوئی مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکا۔

بیوی سے وہ بہت خوش تھا۔ ان میں کبھی لڑائی نہ ہوتی تھی، نوکروں سے بھی وہ ناراض نہیں تھا۔ اس لئے غلام محمد یا نبی بخش دونوں خاموشی سے کام کرنے والے مستعد نوکر تھے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار تھا۔ فروری کے

سہانے دن تھے۔ جن میں کنوار کے پتے کی تازگی تھی۔ ہوا خنک اور ہلکی۔ دن چھوٹے نہ راتیں لمبی۔ نیچر کا توازن بالکل ٹھیک اور قاسم کی صحت بھی خوب تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی کو بغیر وجہ کے اُلو کا پٹھا کہنے کی خواہش اس کے دل میں کیونکر پیدا ہوئی۔

قاسم نے اپنی زندگی کے اٹھائیس ۲۸ برسوں میں متعدد لوگوں کو اُلو کا پٹھا کہا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی کڑے لفظ اس نے بعض موقعوں پر استعمال کئے ہونگے اور گندی گالیاں دی ہوں گی مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر خواہش بہت پہلے اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مگر اچانک طور پر اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کو اُلو کا پٹھا کہنا چاہتا ہے اور یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی جیسے اُس نے اگر کسی کو اُلو کا پٹھا نہ کہا تو بہت بڑا حرج ہو جائے گا۔

دانت صاف کرنے کے بعد اس نے چھلے ہوئے مسوڑوں کو اپنے کمرے میں جا کر آئینے میں دیکھا مگر دیر تک ان کو دیکھتے رہنے سے بھی وہ خواہش نہ دبی جو ایکا ایکی اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی!

قاسم منطقی قسم کا آدمی تھا۔ وہ بات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی تھا۔ آئینہ میز پر رکھ کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگا۔

"مان لیا کہ میرا کسی کو اُلو کا پٹھا کہنے کو جی چاہتا ہے ...... مگر یہ کوئی بات تو نہ ہوئی ...... میں کسی کو اُلو کا پٹھا کیوں کہوں؟ —— میں کسی سے ناراض بھی تو نہیں ہوں ......"

یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر سامنے دروازے کے بیچ میں رکھے ہوئے حقے پر پڑی۔ ایک دم اس کے دل میں یہ باتیں پیدا ہوئیں۔ عجیب واہیات ہے نوکر نے دروازے کے عین بیچ میں یہ حقہ ٹکا دیا ہے۔ میں ابھی اس دروازے سے

اندر آیا ہو، اگر ٹھوکر سے بھری ہوئی چلم گر پڑتی تو پا انداز جو کہ مونج کا بنا ہوا ہے جلنا شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی قالین بھی......

اُس کے جی میں آئی کہ غلام محمد کو آواز دے۔ جب وہ بھاگا ہوا اُس کے سامنے آ جائے تو وہ بھرے ہوئے حقّے کی طرف اشارہ کرکے اس سے صرف اتنا کہے "تم نرے اُلّو کے پٹھے ہو"۔ مگر اس نے تامل کیا اور سوچا یوں بگڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر غلام محمد کو اُلّو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو وہ بات پیدا نہ ہوگی اور پھر...... اس بیچارے کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے۔ میں دروازے کے پاس بیٹھ کر ہی تو ہر روز حقہ پیتا ہوں۔

چنانچہ وہ خوشی جو ایک لمحہ کے لئے قاسم کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ اس نے اُلّو کا پٹھا کہنے کے لئے ایک اچھا موقعہ تلاش کر لیا غائب ہو گئی۔

دفتر کے وقت میں ابھی کافی دیر تھی پورے دو گھنٹے پڑے تھے، دروازہ کے پاس کرسی رکھ کر قاسم اپنے معمول کے مطابق بیٹھ گیا اور حقّہ نوشی میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ سوچ بچار کئے بغیر حقّے کا دھواں پیتا رہا اور دھوئیں کے انتشار کو دیکھتا رہا۔ لیکن جونہی وہ حقّے کو چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لئے ساتھ کے کمرے میں گیا تو اس کے دل میں وہی خواہش نئی تازگی کے ساتھ پیدا ہوئی۔

قاسم گھبرا گیا۔ بھئی حد ہو گئی ...... اُلّو کا پٹھا ...... میں کسی کو اُلّو کا پٹھا کیوں کہوں اور بفرض محال میں نے کسی کو اُلّو کا پٹھا کہہ بھی دیا تو کیا ہوگا......

قاسم دل ہی دل میں ہنسا۔ وہ صحیح الدماغ آدمی تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ خواہش جو اس کے دل میں پیدا ہوئی ہے وہ بالکل بیہودہ اور

بے بہر دیا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ دبانے پر اور بھی وہ زیادہ اُبھر آتی تھی۔

قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے اُلّو کا پٹھا کہے گا خواہ یہ خواہش صدیوں تک اُس کے دل میں تلملاتی رہے، شاید اسی احساس کے باعث یہ خواہش جو بھٹکی ہوئی چمگادڑ کی طرح اس کے روشن دل میں چلی آئی تھی، اس قدر تڑپ رہی تھی۔

پتلون کے بٹن کے بند کرتے وقت جب اُس نے دماغی پریشانی کے باعث، اوپر کا بٹن نچلے کاج میں داخل کر دیا تو وہ جھلّا اٹھا بھئی ہو گا ...... یہ کیا بیہودگی ہے .... دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے .... اُلّو کا پٹھا کہو --- اُلّو کا پٹھا کہو اور یہ پتلون کے سارے بٹن مجھے پھر بند کرنے پڑینگے

لباس پہن کر وہ میز پر آ بیٹھا - اس کی بیوی نے پیالہ بنا کر پیالی اس کے سامنے رکھدی اور توس پر مکھن لگانا شروع کر دیا۔ روزانہ معمول کی طرح ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی، توس اتنے اچھے سنکے ہوئے تھے کہ بسکٹ کی طرح کڑ کڑے تھے اور ڈبل روٹی بھی اعلیٰ قسم کی تھی خمیر سے خوشبو آ رہی تھی مکھن صاف تھا، چائے کی کیتلی بے داغ تھی اس کی ہتھی کے ایک کونے پر قاسم ہر روز میل دیکھا کرتا تھا۔ مگر آج وہ بھی دھبہ نہیں تھا۔

اُس نے چائے کا ایک گھونٹ پیا - اُس کی طبیعت خوش ہو گئی، خالص دارجلنگ کی چائے تھی۔ جس کی مہک پانی میں بھی برقرار تھی دودھ کی مقدار بھی صحیح تھی۔

قاسم نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا "آج چائے کا رنگ بہت ہی پیارا ہے اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی ہے۔

بیوی تعریف سن خوش ہوئی۔ مگر اس نے منہ بنا کر ایک ادا سے کہا "جی ہاں بس آج اتفاق سے اچھی بن گئی ہے ورنہ ہر روز تو آپ کو نیم گھول کر

پلائی جاتی ہے...... مجھے سلیقہ کہاں آتا ہے ـــ سلیقے والیاں تو وہ موئی ہوٹل کی چھوکریاں ہیں جن کے آپ ہر وقت گُن گایا کرتے ہیں"

یہ تبصرہ سُن کر قاسم کی طبیعت مکدّر ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے جی میں آئی کہ چائے کی پیالی میز پر اُلٹ دے اور وہ نیم جو اُس نے اپنے بچے کی پھنسیاں دھونے کے لئے غلام محمد سے منگوائی تھی اور سامنے پڑے طاقچے پر پڑی تھی گھول کر پی لے مگر اُس نے بردباری سے کام لیا۔" یہ عورت میری بیوی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بات بہت ہی بھونڈی ہے مگر ہندوستان میں سب لڑکیاں بیوی بن کر ایسی بھونڈی باتیں ہی کرتی ہیں؟ اور بیوی بننے سے پہلے اپنے گھروں میں وہ اپنی ماؤں سے کیسی باتیں سنتی ہیں؟ بالکل ایسی ادنیٰ قسم کی باتیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عورت کو عمومی زندگی میں اپنی حیثیت کی خبر ہی نہیں....... میری بیوی تو پھر بھی غنیمت ہے یعنی صرف ایک ادا کے طور پر ایسی بھونڈی بات کہدیتی ہے، اس کی نیت نیک ہوتی ہے۔ بعض عورتوں کا تو یہ شعار ہوتا ہے کہ ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہیں۔

یہ سوچ کر قاسم نے اپنی نگاہیں طاقچے پر ہٹا لیں۔ جس میں نیم کے پتے دھوپ میں سوکھ رہے تھے اور بات کا رخ بدل کر اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا:" دیکھو آج نیم کے پانی سے بچے کی ٹانگیں ضرور دھو دینا۔ نیم زخموں کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے......... اور دیکھو موسمبیوں کا رس ضرور پیا کرو......... میں دفتر سے لوٹتے ہوئے ایک درجن اور لے آؤں گا۔ یہ رس تمہاری صحت کے لئے بہت ضروری ہے"

بیوی مُسکرادی،" آپ کو تو بس ہر وقت میری ہی صحت کا خیال رہتا ہے۔ اچھی بھلی تو ہوں۔ کھاتی ہوں، پیتی ہوں، دوڑتی ہوں

بھاگتی ہوں...... میں نے جو آپ کے لئے بادام منگوا کے رکھے ہیں ...... بھی آج دس بیس آپ کی جیب میں ڈالے بغیر نہ رہوں گی ...... لیکن دفتر میں کہیں نہ بانٹ دیجئے گا۔"

قاسم خوش ہو گیا کہ چلو موسمبیوں کے رس اور باداموں نے اس کی بیوی کے مصنوعی غصّے کو دور کر دیا اور یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا دراصل قاسم ایسے مرحلوں کو آسانی کے ساتھ ان طریقوں ہی سے طے کیا کرتا تھا جو اس نے پڑوس کے پرانے شوہروں سے سیکھے تھے اور اپنے گھر کے ماحول کے مطابق ان میں بہت یا تھوڑا ردّ و بدل کر لیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگایا اور اُٹھ کر دفتر جانے کی تیاری کرنے ہی والا تھا کہ پھر وہی خواہش نمودار ہو گئی اس مرتبہ اُس نے سوچا۔ میں اگر کسی کو اُلّو کا پٹھا کہہ دوں تو کیا حرج ہے۔ زیرِ لب بالکل ہولے سے یہ کہہ دوں اُلّو...... کا...... پٹھا...... تو میرا خیال ہے کہ مجھے دلی تسکین ہو جائے گی۔ یہ خواہش میرے سینے میں بوجھ بن کر بیٹھ گئی ہے کیوں نہ اس کو ہلکا کر دوں۔ دفتر میں۔

اُس کو صحن میں بچّے کا کموڈ نظر آیا یوں صحن میں کموڈ رکھنا سخت بدتمیزی تھی اور خصوصاً اس وقت جب کہ ناشتہ کر چکا تھا اور خوشبودار گرم گرم توس اور تلے ہوئے انڈوں کا ذائقہ ابھی تک اُس کے مُنہ میں تھا...... اُس نے زور سے آواز دی غلام محمد۔"

قاسم کی بیوی جو ابھی تک ناشتہ کر رہی تھی بولی "غلام محمد باہر گوشت لینے گیا ہے...... کوئی کام تھا آپ کو اُس سے؟"

ایک سکنڈ کے اندر اندر قاسم کے دماغ میں بہت سی باتیں آئیں، کہہ دوں، یہ غلام محمد اُلّو کا پٹھا ہے...... اور یہ کہہ کر جلدی سے باہر نکل جاؤں

......نہیں...... وہ خود تو موجود ہی نہیں، پھر...... بالکل بیکار ہے.... لیکن سوال یہ ہے کہ بچارے غلام محمد ہی کو کیوں نشانہ بنایا جائے۔ اس کو تو میں ہر وقت "الو" کا پٹھا کہہ سکتا ہوں.....

قاسم نے ادھ جلا سگریٹ گرا دیا اور بیوی سے کہا: "کچھ نہیں میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ دفتر میں میرا کھانا بے شک ڈیڑھ بجے لے آیا کرے..... تمہیں کھانا جلدی بھیجنے میں بہت تکلیف کرنی پڑتی ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو فرش پر اس کے گرائے ہوئے سگریٹ کو دیکھ رہی تھی قاسم کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا یہ سگریٹ اگر بجھ گیا اور یہاں پڑا رہا تو اس کا بچہ رینگتا رینگتا آئے گا اور اسے اٹھا کر منہ میں ڈال لے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے پیٹ میں گڑبڑ مچ جائیگی قاسم نے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر غسل خانے کی موری میں پھینک دیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر غلام محمد کو "الو کا پٹھا" نہیں کہدیا اس سے اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو ابھی ابھی مجھ سے بھی تو غلطی ہوئی تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میری غلطی زیادہ شدید تھی......

قاسم بڑا صحیح الدماغ آدمی تھا اُسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ صحیح خطوط پر غور و فکر کرنے والا انسان ہے۔ مگر اس احساس نے اُس کے اندر برتری کا خیال کبھی پیدا نہیں کیا تھا۔ یہاں پر پھر اس کی صحیح الدماغی کو دخل تھا کہ وہ احساس برتری کو اپنے اندر دبا دیا کرتا تھا۔

موری میں سگریٹ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اس نے بلا ضرورت صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ دراصل کچھ دیر کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا، اُسکی بیوی ناشتے کا آخری توس کھا چکی تھی قاسم کو یوں ٹہلتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آئی اور کہنے لگی "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

قاسم چونک پڑا "کچھ نہیں.... کچھ نہیں..... دفتر کا وقت ہو گیا کیا؟"

یہ لفظ اُس کی زبان سے نکلے اور دماغ میں وہی اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔

اُس کے جی میں آئی کہ بیوی سے صاف صاف کہدے کہ یہ عجیب و غریب خواہش اُس کے دل میں پیدا ہوگئی ہے جس کا سر ہے نہ پیر، بیوی ضرور ہنسے گی اور یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ اُس کو بیوی کا ساتھ دینا پڑ گیا چنانچہ یوں ہنسی ہنسی میں اُلّو کا پٹھا کہنے کی خواہش اُس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ مگر اُس نے غور کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں بیوی ہنسے گی اور میں خود بھی ہنسوں گا۔ لیکن نہ ہو کہ یہ بات مستقل مذاق بن جائے ..... ایسا ہو سکتا ہے ..... ہو سکتا ہے، کیا، ضرور ہو جائے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انجام کار خوشگواری پیدا ہو چنانچہ اُس نے اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا اور ایک لمحہ تک اُس کی طرف یوں ہی دیکھتا رہا۔

بیوی نے بچے کا کموڈ اٹھا کر کونے میں رکھ دیا اور کہا "آج صبح کو آپ کے برخوردار نے وہ ستایا کہ اللہ کی پناہ —— بڑی مشکلوں کے بعد میں نے اُسے کموڈ پر بٹھایا۔ اس کی مرضی یہ تھی کہ بستر ہی کو خراب کرے .... آخر لڑکا کس کا ہے؟" ....

قاسم کو اس قسم کی چیخ پسند تھی۔ ایسی باتوں میں وہ تیکھے مزاح کی جھلک دیکھتا تھا۔ مسکرا کر اُس نے بیوی سے کہا "لڑکا میرا ہی ہے مگر ...... میں نے تو آج تک کبھی بستر خراب نہیں کیا۔ یہ عادت اُس کی اپنی ہوگی"

بیوی نے اُس کی بات کا مطلب نہ سمجھا۔ قاسم کو مطلقاً افسوس نہ ہوا اس لئے کہ ایسی باتیں وہ صرف اپنے منہ کا ذائقہ درست رکھنے کیلئے کیا کرتا تھا وہ اور بھی خوش ہوا جب اس کی بیوی نے جواب نہ دیا اور خاموش ہوگئی۔

"اچھا بھئی میں اب چلتا ہوں۔ خدا حافظ!"

یہ لفظ جو ہر روز اُس کے منہ سے نکلتے تھے آج بھی اپنی پرانی آسانی کے ساتھ نکلے اور قاسم دروازہ کھول کر باہر چلدیا۔"

تیسرا گیٹ سے نکل کر جب وہ نکلسن پارک کے پاس سے گذر رہا تھا تو اُسے ایک داڑھی والا آدمی نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں کھلی ہوئی شلوار تھامے وہ دوسرے ہاتھ سے استنجا کر رہا تھا۔ اُس کو دیکھ کر قاسم کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی۔ لو بھئی۔ یہ آدمی ہے جس کو اُلّو کا پٹھا کہنا چاہیے۔ یعنی جو صحیح معنوں میں اُلّو کا پٹھا ہے...... ذرا انداز ملاحظہ ہو..... کس انہماک سے ڈرائی کلین کیے جا رہا ہے.... جیسے کوئی بہت اہم کام سرانجام پا رہا ہے..... لعنت ہے!

لیکن قاسم چونکہ ذکی الدماغ آدمی تھا اس لئے تعجیل سے کام نہ لیا اور اچھی طرح غور کیا۔ میں اس فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں اور وہ دوسرے فٹ پاتھ پر، اگر میں نے بلند آواز میں بھی اُس کو اُلّو کا پٹھا کہا تو وہ چونکے گا نہیں۔ اس لئے کہ کم بخت اپنے کام میں بہت بُری طرح مصروف ہے۔ چاہیے تو یہ کہ اُس کے کان کے پاس زور سے نعرہ بلند کیا جائے اور جب وہ چونک اُٹھے تو اسے بڑے شریفانہ طور پر سمجھایا جائے، قبلہ آپ اُلّو کے پٹھے ہیں...... لیکن اس طرح بھی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوگا چنانچہ قاسم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اسی اثنا میں اُس کے پیچھے سے ایک سائیکل نمودار ہوئی۔ کالج کی ایک لڑکی اُس پر سوار تھی۔ اس لیے کہ پیچھے بستہ بندھا ہوا تھا۔ آناً فاناً اس لڑکی کی ساڑھی فری وہیل کے دانتوں میں پھنسی، لڑکی نے گھبرا کر اگلے پہیے کا بریک دبایا۔ ایک دم سائیکل بے قابو ہوئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑکی سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑی۔

قاسم نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لیا۔ اسلئے

کہ اس نے اس حادثہ کے ردِ عمل پہ غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ لڑکی کی ساڑھی وہیل کے دانتوں نے چبا ڈالی ہے اور اس کا بورڈر بہت بری طرح ان میں الجھ گیا ہے تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لڑکی کی طرف دیکھے بغیر اس نے سائیکل کا پچھلا پہیا ذرا اونچا اٹھایا تاکہ اسے گھما کر ساڑھی کو فری وہیل کے دانتوں میں سے نکال لے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پہیا گھمانے سے ساڑھی کچھ اس طرح تاروں کی لپیٹ میں آئی کہ ادھر پیٹی کوٹ کی گرفت سے باہر نکل آئی تاہم بوکھلا گیا۔ اس کی بوکھلاہٹ نے لڑکی کو بہت زیادہ پریشان کر دیا۔ زور سے اس نے ساڑھی کو اپنی طرف کھینچا۔ فری وہیل کے دانتوں میں ایک ٹکڑا اڑ گیا اور ساڑھی باہر نکل آئی۔

لڑکی کا رنگ لال ہو گیا قاسم کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھا اور بھینچے ہوئے لہجہ میں کہا "الو کا پٹھا"

ممکن ہے کچھ دیر لگی ہو گی مگر قاسم نے ایسا محسوس کیا کہ لڑکی نے جھٹ پٹ نہ جانے اپنی ساڑھی کو کیا کیا۔ اور ایک دم سائیکل پر سوار ہو کر نظروں سے غائب ہو گئی۔

قاسم کو لڑکی کی گالی سن کر بہت دکھ ہوا خاص کر اس لئے کہ وہ یہی گالی خود کسی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ بہت صحیح الدماغ تھا، ٹھنڈے دل سے اس نے اس حادثہ پر غور کیا اور اس لڑکی کو معاف کر دیا۔ اس کو معاف کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ عورتوں کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے اور ان عورتوں کو سمجھنا تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جو سائیکل پر سے گری ہوئی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس نے اپنی لمبی جراب میں اوپر ران کے پاس

تین چار کاغذ کیوں اُڑس رکھے تھے ؟ “

نامکمّل تحریر

میں جب کبھی ذیل کا واقعہ یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔

ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ جس کے باعث موسم خنک ہوگیا تھا۔ جب میں صبح سویرے غسل کے لئے ہوٹل سے باہر نکلا تو دُھلی ہوئی پہاڑیوں اور نہائے ہوئے ہرے بھرے پیڑوں کی تازگی دیکھ کر طبیعت پر وہی کیفیت پیدا ہوئی جو خوبصورت کنواریوں کے جھرمٹ میں بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بارش بند تھی البتہ ننھی ننھی پھُوار پڑ رہی تھی۔ پہاڑیوں کے اونچے اونچے درختوں پر آوارہ بدلیاں اونگھ رہی تھیں گویا رات بھر برسنے کے بعد تھک کر چور چور ہو گئی ہیں۔

کاندھے

میں چشمے کی طرف روانہ ہوا۔ کاندھے پر تولیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں صابن دانی تھی، دوسرے میں نیکر۔ جب سڑک کا موڑ طے کرنے لگا تو آنکھوں کے سامنے دُھندلی دُھند نظر آئی۔ بادل کا ایک بھولا بھٹکا ٹکڑا تھا جو شاید آسمانی فضا سے اُکتا کر اِدھر آ نکلا تھا۔ اس بادل نے سڑک کے دوسرے حصّے کو آنکھوں سے بالکل اوجھل

کر دیا تھا۔ میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی سپیدی ہی نظر آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ اوپر سے کوئی دھنکی ہوئی روئی بکھیر رہا ہے!

اتنے میں ہوا کے تیز جھونکوں نے اس سپیدی میں ارتعاش پیدا کیا اور اس دھند میں سے دود مثال بخارات علیحدہ ہونے لگے اور میری ننگی باہوں سے مس ہوئے۔ رت سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی سردی کے احساس سے وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو ان بخارات نے پیدا کی۔

اس بادل میں سے گزرتے وقت سانس کے ذریعے سے یہ سپید سپید بخارات نے میرے اندر داخل ہو گئے جس سے پھیپھڑوں کو بڑی راحت محسوس ہوئی۔ میں نے جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا جب بادل کے اس ٹکڑے کو طے کر کے میں باہر آیا تو آنکھوں کو کچھ سجھائی نہ دیا میرے چشمے کے شیشے کاغذ کے مانند سفید ہو گئے تھے۔ پھر ایکا ایکی مجھے سردی محسوس ہونے لگی اور جب میں نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو وہ شبنم آلود تکیے کی طرح گیلے ہو رہے تھے!

میں غسل خانے کے معاملے میں بے حد سست ہوں اور سردیوں کے موسم میں تو روزانہ غسل کا میں قائل بالکل نہیں ہوں۔ دراصل نہانے دھونے کا فلسفہ میری سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا ہے۔ غسل کا مطلب یہ ہے کہ غلاظت دور کی جائے اور روز نہانے کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی رات ... میں غلیظ اور گندہ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ منہ دھو لیا جائے پیر صاف کر لئے جائیں، سر کے بال دھو لئے جائیں۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں جلدی میلی ہو جاتی ہیں مگر ہر روز بدن کیوں صاف کیا جائے جب کہ یہ بہت دیر کے بعد میلا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو خیر میں نہانے کا مطلب

سمجھ سکتا ہوں۔ مگر سردیوں میں اس کا مصرف مجھے نظر نہیں آتا۔ آخر کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہر روز صبح کو سویرے انسان غسل خانے میں جائے سردی کے مارے پورے دو گھنٹوں تک دانت بجتے رہیں۔ انگلیاں سُن ہو جائیں، اور ناک برف کی ڈلی بن جائے ـــــ غسل نہ ہوا، اچھی خاصی مصیبت ہوئی۔

غسل کے بارے میں اب بھی میرا یہی خیال ہے، لیکن جس پہاڑی گاؤں کا میں ذکر کر رہا ہوں وہاں کی فضا ہی کچھ اس قسم کی تھی کہ جو چیزیں مجھے اب مہمل نظر آتی ہیں یا اس سے پہلے نظر آیا کرتی تھیں وہاں بامعنی دکھائی دیتی تھیں ـــــ اس غسل ہی کو لیجئے جو اس پہاڑی گاؤں میں جتنا عرصہ میں رہا ہر روز میرا کام پہلا یہ ہوتا تھا کہ نہاؤں دیر تک نہاتا رہوں۔

چشمے پر پہونچ کر میں نے کپڑے اتارے۔ نیکر پہنی اور جب پانی کی اُس کی گرتی ہوئی دھار کے پاس گیا جو پتھروں پر گر کر ننھے ننھے چھینٹے اڑا رہی تھی تو پانی کی ایک سرد بوند میری پیٹھ پر آ پڑی۔ میں تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ جہاں بوند گری تھی اُس جگہ گدگدی پرکار کی نوک کی طرح چبھی اور سارے جسم پر پھیل گئی۔ میں سمٹا۔ کانپا اور سوچنے لگا۔ مجھے واقعی نہانا چاہئے یا کہ نہیں۔ قریب تھا کہ میں باغی ہو جاؤں لیکن آس پاس نگاہ دوڑائی تو ہر سمت تنہائی ہوئی نظر آئی۔ چنانچہ جو باغیانہ خیال میرے دماغ میں اُس شریر بوند نے پیدا کئے تھے ٹھنڈے ہو گئے!

سرد پانی کی گدگدیاں شروع شروع میں تو مجھے بہت ناگوار گذریں مگر جب میں جی کڑا کر کے دھار کے نیچے بیٹھ گیا تو وہ لطف آیا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ دونوں ہاتھوں کے ساتھ زور زور سے پانی کے چھینٹے اڑانے سے سردی کی شدت کم ہو جاتی تھی، چنانچہ جب میں نے یہ گُر معلوم کر لیا تو پھر اُس لطف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

سرد پانی کی موٹی دھار سے عجیب کیفیت پیدا کر دی

پانی کے دباؤ سے بال پیشانی پر سے نیچے لٹک آئے اور انہوں نے آنکھوں اور منہ میں گھسنا شروع کر دیا تو زور زور سے پھونکیں مار کر اُن کو ہٹانے کی ناکام سعی نے مزا اور بھی دوبالا کر دیا۔ کبھی کبھی ڈوب کر اُبھرتے ہوئے آدمی کا احساس بھی مجھے ہوا اور میں نے سوچا کہ جو لوگ ڈوب کر مر جاتے ہیں ان کو ایسی موت میں بے حد لطف آتا ہوگا۔ چشمے کا پانی آنسوؤں کی طرح شفاف تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اردگرد بلبلوں اور پانی کے چھینٹوں کا مشاعرہ ہو رہا ہے۔

غسل سے فارغ ہو کر میں نے تولیے سے بدن پونچھا اور سردی کا احساس کم کرنے کے لیے دھیمے دھیمے سُروں میں ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا کبھی کبھی یہ سُریلی گنگناہٹ ہوا کے جھونکوں سے مرتعش ہو جاتی اور میں یہ سمجھتا کہ میرے بجائے کوئی اور آدمی بہت دُور گا رہا ہے۔ اس پر میں تولیے کو زیادہ زور کے ساتھ بدن پر ملنے لگتا۔

بدن خشک ہو گیا تو میں نے کپڑے پہنے اس اثنا میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میرے عین اوپر بادل کا ایک ٹکڑا اسفنج نما، چھتری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پہاڑی پر سے نیچے اُترنا شروع کیا اور فوراً ہی کودتا پھاندتا سڑک میں اُتر آیا متوقع بارش سے بچنے کے لیے میں نے قدم تیز کر دیئے۔ لیکن ابھی سڑک پر بمشکل ایک جریب کا فاصلہ طے کرنے پایا تھا کہ "اے بکری بکری" کی آواز بلند ہوئی پھر اس کے ساتھ ہی دو پہاڑیوں نے اس آواز کو دبوچ کر دوبارہ ہوا میں اُچھال دیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بھی اس آواز کو گیند کی طرح دبوچ لوں مگر ہمیشہ کے لیے اپنی جیب میں ڈال لوں۔

میں ٹھہر گیا۔ یہی مانوس دل نواز صدا تھی جو اس سے قبل میں کئی مرتبہ سُن چکا تھا بظاہر "اے بکری بکری" تین معمولی لفظ ہیں اور

کاغذ پہ کوئی ایسا تصور پیش نہیں کرتے جو اُتنا حسین ہو مگر واقعہ ہے۔ کہ میرے لئے ان میں وہ سب کچھ تھا جو روح کو مسرور کر سکتا ہے۔ جوں ہی یہ آواز میری سماعت سے مَس ہوتی مجھے یہ معلوم ہوتا کہ پہاڑ کی چھاتی میں سے صدیوں کی رُکی ہوئی آواز نکلی ہے اور سیدھی آسمان تک پہونچ گئی ہے۔

"واے"، بالکل دھیمی آواز میں اوز "بکری بکری" بلند اور فلک رس سُروں میں ایک لمحہ کے لئے یہ نعرہ شباب پہاڑیوں کی سنگین دیواروں کو گونجا دیتا، اُبھرتا، تھرتھراتا اور رباب کے تاروں کی آخری لرزش کی طرح کانپتا فضا میں گھُل مل جاتا۔

کالی کالی بدلیاں چھا رہی تھیں فضا نم آلود تھی ہوا کے جھونکوں میں اس نمی نے غنودگی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ میں نے اوپر پہاڑی پر اُگی ہوئی ہری ہری جھاڑیوں کی طرف دیکھا اور ان کے عقب میں مجھے دو تین سفید بکریاں نظر آئیں۔ میں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ ایک منہ زور بکری وزیر کو گھسیٹے لئے جا رہی تھی اور وہ اُس کو ڈانٹ بتانے کیلئے "اے بکری بکری" پکار رہی تھی اُس کا منہ غصّہ اور زور لگانے کے باعث پگھلتے ہوئے تانبے کی رنگت اختیار کر گیا تھا بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی کو پوری طاقت سے کھینچنے میں اس کا سینہ غیر معلوم طور پر عریاں ہو گیا تھا سر پیچھے جھکایا تھا۔ دونوں ہاتھ آگے بڑھے ہوئے سر سے پر سے دوپٹہ اُتر کر باہوں میں چلا آیا تھا۔ پیشانی پر سیاہ بالوں کی لٹیں بل کھاتی ہوئی سنپولیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

ایک سبز جھاڑی کے پاس پہونچ کر بکری دفعتہً ٹھہر گئی اور اس کے نرم نرم پتوں کو اپنی تھوتھنی سے سونگھنا شروع کر دیا یہ دیکھ کر وزیر نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنا اترا ہوا دوپٹہ ایک بڑے سے پتھر پر رکھ کر

GOVT GIRLS COL[illegible]
LIBRARY

اُس نے پاس والے درخت کے تنے سے بکری کے گلے میں بندھی ہوئی رسی باندھی اور دو نیم کے پیڑ کی جھکی ہوئی ٹہنی پکڑ کر جھولا جھولنے لگی۔

میں جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ بازو اوپر اُٹھا لینے کے باعث اُس کی کھلی آستینیں نیچے ڈھلک آئیں۔ کپڑے کے یہ چھلکے سے جب اُتر گئے تو اُس کے بازو کندھوں تک عریاں ہو گئے۔ بڑی خوبصورت، بانہیں تھیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کے دو بڑے دانت اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں۔ بے داغ ہموار اور زندگی سے بھرپور۔

وہ جھولا جھول رہی تھی اور اُس کے دونوں بازو کچھ انداز سے اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے کہ مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ آسمان کی طرف پرواز کر جائے گی۔ جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر میں اُس کے سامنے آ گیا دفعتہً اُس نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں سٹ پٹائی ٹہنی کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ گری، سنبھلی اور حلق میں سے ایک مدھم چیخ نکالتی دوڑ کر دوپٹہ لینے کیلئے پتھر کی طرف بڑھی —— مگر دوپٹہ میری بغل میں تھا۔

اُس نے دوپٹہ کی تلاش میں یہ جانتے بوجھتے کہ وہ میری بغل میں ہے اِدھر اُدھر دیکھا اور مسکرا دی اور اس کی آنکھوں میں حیا کے گلابی ڈورے اُبھر آئے۔ گال، اور سرخ ہو گئے اور وہ سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ دونوں بازوں کی مدد سے اس نے اپنے سینے کی شوخیوں کو چھپا لیا اور انہیں اور زیادہ چھپا لینے کی کوشش کرتی وہ پتھر پر بیٹھ گئی اور اس پر بھی جب اسے اطمینان نہ ہوا تو اُس نے گھٹنے اوپر کر لئے اور مجھ سے بگڑ کر کہنے لگی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میرا دوپٹہ لائیے۔"

میں بڑھا اور بغل میں سے دوپٹہ نکال کر اُس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ مجھے اُس کے بیٹھنے کا انداز بہت پسند آیا۔ چنانچہ میں بھی اُسی طرح اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وزیر جوان آوازوں کا ایک بہت بڑا انبار ہے اور میں...... اور میں خدا معلوم کیا ہوں۔ اُس کو ہاتھ لگاؤں گا تو وہ باجے کی طرح بجنا شروع ہو جاوے گی۔ ایسے سُر اس میں سے نکلیں گے جو مجھے بہت اوپر لے جائیں گے۔ اور زمین و آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق کر دیں گے جہاں میں کوئی آواز سُن نہ سکوں گا۔

وزیر نے مجھے جنگلی بلّی کی طرح گھور کر دیکھا گویا کہنا چاہتی ہے اب جاؤ یہاں دھرنا دے کر کیوں بیٹھ گئے ہو۔ میں نے اُس کے اس خاموش حکم کی کوئی پروا نہ کی اور کہا:۔

"چشمے سے واپس آ رہا تھا کہ تمہاری آواز سنی بے اختیار کھنچا چلا آیا وزیر — تمہاری یہ آواز مجھے یقیناً پاگل بنا دے گی — جانتی ہو پاگل آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں"

میری یہ بات سنکر اُس کو حیرت ہوئی "یہ کیا پاگل پن ہے — میری آواز کسی کو کیوں پاگل بنانے لگی"

میں نے کہا "جیسے کچھ جانتی ہی نہیں ہو......... دنیا میں یہ راگ راگنیاں کہاں سے آئی ہیں....... لیکن چھوڑو اس قصے کو یہ بتاؤ، میری ایک بات مانو گی؟

"مان لونگی، پر آپ یہ تو کہیئے بات کیا ہے؟"

"ایک دفعہ میری خاطر، اے، بکری بکری، کا نعرہ بلند کر دو"

مجھے ہاتھ سے دھکا دے کر اُس نے تیز لہجے میں کہا۔ یہ کیا پاگل پن ہے؛ بنانے کے لئے۔ صرف میں ہی ایک رہ گئی

ہوں۔

"وزیر! بخدا میں تمہیں بنا نہیں رہا۔ مجھے تمہاری آواز پسند ہے۔ جھوٹ کہوں تو .... لیے اب مان بھی جاؤ۔ بس ایک بار!"

"جی نہیں!"

"میں تم سے التجا کرتا ہوں!"

"میں نے یہ آواز نہ کبھی نکالی ہے اور نہ اب نکالوں گی۔"

"میں ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں!"

"یا اللہ ——— یہ کیا مصیبت ہے!" وزیر نے اپنا بدن سکیڑ لیا۔ "اور اگر میں نہ مانوں تو .... یعنی یہ بھی کیا ضد ہی ہے کہ میں اسی وقت آپ کے کہنے پر بے کار چلانا شروع کر دوں ——— آپ تو خواہ مخواہ چھیڑ خانی کر رہے ہیں اور میں نگوڑی جانے کیا سمجھ رہی ہوں ——— بھئی ہوگا، مذاق اچھا نہیں لگتا۔"

"وزیر! میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "میری طرف، دیکھو! ..... میرے چہرے سے تم اس بات کا اطمینان کر سکتی ہو کہ میں ہنسی مذاق نہیں کر رہا۔"

اُس نے میرے چہرے کی طرف مصنوعی غور سے دیکھا۔ اور میری ناک پر اُنگلی رکھ کر کہا "آپ کی ناک پہ یہ ننھا سا تل کتنا بھلا دکھائی دیتا ہے۔"

اُس وقت میرے جی میں آئی کہ اس پتھر پر جس پر وہ بیٹھی ہے میں اپنی ناک گھسنا شروع کر دوں تاکہ وہ ننھا سا تل ہمیشہ کے لئے مٹ جائے۔ وزیر نے میری طرف دیکھا تو وہ، یہ سمجھی کہ میں رونے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ چنانچہ اُس نے فوراً اپنی بکریوں کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا "بابا آپ خفا نہ ہوجیے ......"

قریب تھا کہ وہ اپنی مخصوص آواز بلند کرے۔ کہ ایکا ایکی، جھجک، اس پر غالب آ گئی۔ بہت زیادہ شرما کر اس نے اپنی گردن جھکالی" پر میں پوچھتی ہوں اس میں خاص بات ہی کیا ہے

میں نے بگڑ کر کہا،" وزیر، تم اب باتیں نہ بناؤ!"

دوسری طرف منہ کر کے اس نے ایکا ایکی بلند آواز میں "اے بجری" پکارا اس کے بعد شرمیلی ہنسی کا ایک فوارہ سا اس کے منہ سے چھوٹ پڑا۔ میں بلندیوں میں پرواز کر گیا۔ کتنی صاف اور شفاف آواز تھی۔ دھلی ہوئی فضا میں اس کی گونج دیر تک دور، نظر سے اوجھل ہو جانے والے پرندوں کے پروں کی طرح چمکتی رہی۔ پھر جذب ہو گئی۔

وزیر کی طرف میں نے دیکھا کہ۔ اب وہ خاموش تھی، اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر صاف تھا۔ آنکھیں نہاتی ہوئی چڑیوں کی طرح بے قرار تھیں ہنسنے کے باعث ان میں آنسو بھر آئے ہونٹ اس انداز سے کھلے ہوئے تھے کہ میرے ہونٹوں میں سرسراہٹ پیدا ہو گئی ——— خدا معلوم کیا ہوا......

میں نے وزیر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کا سر، میری گودی میں ڈھلک آیا ——— لیکن ایکا ایکی زور سے وہ اپنا بازو میرے جھکے ہوئے سر اور اپنے منتظر چہرے کے درمیان لے آئی، اور دھڑکتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی" آہ، ہٹائیے ہٹائیے، ان ہونٹوں کو!"

میری گود سے نکل کر وہ بھاگ گئی اور میرے ہونٹوں کی تحریر نامکمل رہ گئی۔

اس واقعہ کو ایک زمانہ گذر چکا ہے۔ مگر جب کبھی

میں اس کو یاد کرتا ہوں میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں ——————— یہ نا مکمل بوسہ ہمیشہ، میرے ہونٹوں پر اٹکا رہے گا۔

قبض

نئے لکھے ہوئے مکالمے کا کاغذ میرے ہاتھ میں تھا۔ ایکٹر اور ڈائریکٹر کیمرے کے پاس سامنے کھڑے تھے۔ شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس لیے کہ اسٹڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ چل رہا تھا ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا کیونکہ شوٹنگ کی دوران میں ایکا ایکی جب اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی تو کئی کئی ہزار فٹ فلم کا ٹکڑا بیکار ہو جاتا ہے اور ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔

ڈائرکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن کے درمیان کیمرے کے پاس کھڑے سگرٹ پی رہے تھے اور میں ستانے کی خاطر کرسی پر ٹانگیں سمیت بیٹھا تھا۔ وہ یوں کہ میری دونوں ٹانگیں کرسی کی نشست پر تھیں، اور میرا بوجھ نشست کی بجائے اُن پر تھا۔ میری اس عادت پر بہت لوگوں کا اعتراض ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔

نینا جس کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں۔ ڈائرکٹر صاحب کے پاس

آیا اور کہنے لگا " صاحب ، بولتا ہے کہ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے ۔ پھر شور بند ہو جائے گا "

یہ روز مرہ کی بات تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک بیکار رہنا ہے میں صابن کیٹے اور ان پر پٹھے لگتے رہیں گے چنانچہ ڈائرکٹر صاحب ہیرو اور ہیروئن سمیت اسٹوڈیو سے باہر چلے گئے ۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھا رہا ۔

سقفی لیمپ کی ناکافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں پڑی تھیں ان کا درمیانی فاصلہ اصلی فاصلے پر کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا ۔ اور گیروے رنگ کے تھری پلائی وڈ کے تختے جو دیواروں کی صورت میں کھڑے تھے ۔ پست قد دکھائی دیتے تھے میں اس تبدیلی پہ غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی " السلام علیکم " میں نے جواب دیا ۔ علیکم السلام اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی ۔ میری آنکھوں میں " تم کون ہو ؟ " کا سوال تیرنے لگا آدمی ہوشیار تھا ، فوراً کہنے لگا ۔ جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہوا ہوں — میرا نام عبدالرحمٰن ہے ۔ خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہوں —— آپ کا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے !

میں نے کہا جی نہیں —— میں پنجاب کا باشندہ ہوں "

عبدالرحمٰن نے جیب سے عینک نکالی " معاف فرمائیگا ، چونکہ ڈائرکٹر صاحب نے عینک اُتار دینے کا حکم دیا تھا اس لئے ......

اس دوران میں اُس نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکالی اور میری طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا " واللہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ دہلی کے ہیں ، یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں ، — ماشاء اللہ کیا مکالمہ لکھا ہے ...... قلم توڑ دیا ہے واللہ ...... یہ اسٹوری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے ؟ "

عبدالرحمن نے جب یہ باتیں کیں تو اُس کا قد بھی میری نظر میں تھری پلائی وڈ کے تختوں کی طرح پست ہو گیا۔ روکھے پن کے ساتھ کہا "جی نہیں۔"

وہ اور زیادہ لچکیلا ہو گیا۔ "عجیب زمانہ ہے صاحب، جو اہلیتوں کے مالک ہیں اُن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں...... یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ عجیب اوٹ پٹانگ زبان بولتے ہیں یہاں کے لوگ۔ پندرہ دن مجھے یہاں آئے ہو گئے ہیں مگر کیا عرض کروں سخت پریشان ہو گیا ہوں۔ آج آپ سے ملاقات ہو گئی......" اس کے بعد اُس نے اپنے ہاتھ ملکر اُس روغن کی مروڑیاں بنانا شروع کر دیں جو چہرے پر لگاتے وقت اُس کے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔

میں نے جواب میں صرف "جی ہاں" کر دیا اور خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور روا داری میں لکھے ہوئے مکالموں پر نظر ثانی شروع کر دی۔ چند غلطیاں جنکو درست کرنے کے لیئے میں نے اپنا قلم نکالا۔ عبدالرحمن ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا۔ مجھے اُس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا: "فرمایئے"

اُس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا: "میں ایک بات عرض کروں؟"

"بڑے شوق سے۔"

"آپ اس طرح ٹانگیں اوپر کر کے نہ بیٹھا کریں۔"

"کیوں؟"

اُس نے جھک کر کہا: "بات یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے قبض ہو جایا کرتا ہے۔"

"قبض؟" میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ "قبض کیسے ہو سکتا ہے

یہ کہہ کر میرے جی میں آئی کہ اُس سے کہوں "میاں ہوش کی دوا کرو —— گھاس تو نہیں کھا گئے —— مجھے اس طرح بیٹھتے بیس برس ہو گئے۔ آج کیا تمہارے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا" مگر یہ سوچ کر چُپ ہو گیا۔ کہ بات بڑھ جائے گی اور مجھے بے کار کی مغز وردی کرنا پڑے گی!

وہ مُسکرایا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اُس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سُکڑ گیا: "آپ نے مذاق سمجھا ہے حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ٹانگیں جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ میں نے تو اپنی ناچیز رائے پیش کی ہے۔ مانیں نہ مانیں یہ آپ کو اختیار ہے۔"

میں نے بمشکل ہنسی ضبط کیا۔ اس کو اب میں کیا جواب دیتا۔ قبض .... یعنی قبض ہو جائے گا۔ بیس برس کے دوران میں مجھے قبض نہ ہوا لیکن آج اس مسخرے کے کہنے سے مجھے قبض ہو جائے گا۔ قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر بیٹھنے سے۔ جس طرح میں کرسی پر بیٹھتا ہوں، اُس سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے دوسروں کو نہ سہی لیکن مجھے تو اس سے آرام ملتا ہے اور یہ سچی بات ہے کہ مجھے ٹانگیں جوڑ کر سینے کے ساتھ لگا دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسٹوڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑا رہنا پڑتا ہے جس سے آدمی تھک جاتا ہے۔ دوسرے نامعلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دور کرتے ہیں۔ مگر میں تو اسی طریقے سے دور کرتا ہوں۔ کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی نہیں چھوڑ سکتا خواہ قبض کے بجائے مجھے سرسام ہو جائے یہ ضد نہیں، دراصل بات یہ ہے کہ کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا انداز میری عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز مطالبہ ہے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں اکثر لوگوں کو میرے

اِس طرح بیٹھنے کے انداز پر اعتراض کر رہا ہے۔ اس اعتراض کی وجہ نہ میں نے ان لوگوں سے کبھی پوچھی ہے اور نہ اُنھوں نے کبھی بتائی ہے اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو میں اس معاملے میں دلیل سننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ کوئی آدمی بھی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔

جب عبدالرحمٰن نے مجھ پر نکتہ چینی کی تو میں بھنا گیا اور اس کا یوں شکریہ ادا کیا جیسے کوئی یہ کہے "لعنت ہو تم پر"

اس شکریہ کی رسید کے طور پر اُس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر میلی سی مُسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا۔ اتنے میں ڈائرکٹر، ہیرو اور ہیروئن آگئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے سے عبدالرحمٰن کے قبضے سے نجات حاصل ہوئی۔

اُس کی پہلی مُلاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں۔

(۱) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغد ہے۔

(۲) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔

(۳) یہ ایکسٹرا جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پرلے درجہ کا مغز چاٹ ہے۔

(۴) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس سے بعید نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ کہ اُسکی زندگی کچھ عرصہ کیلئے زیادہ متحرک ہو جائے گی میں نفرت کرنیکے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں آپ پوچھیں گے کہ نفرت کرنے میں مہارت کی کیا ضرورت ہے لیکن میں آپ سے کہونگا کہ ہر کام کرنے کیلئے ایک خاص سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے اور نفرت میں چونکہ شدت زیادہ ہے اِس لئے اس کے عامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے۔ محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لیکر

ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں مگر نفرت بہت کم لوگوں سے کی ہے اور جنہوں نے کی ہے اُن میں سے اکثر کو اس کا سلیقہ نہیں آیا۔ نفرت محبّت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف ہے محبت، میں مٹھاس ہے جو اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر نفرت میں ایک ایسی ترشی ہے جو دل کا قوام درست رکھتی ہے۔

میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نفرت اس طریقے سے کرنا چاہیئے کہ اُس میں محبت کرنے کا مزا ملے۔ شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے مجھے اُس سے سو فیصدی اتفاق ہے۔ یہ ایک ایسی نفرت ہے جو شیطان کی شان کے خلاف نہیں اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی موجود ہے تو وہ یقیناً اس نفرت سے جو کہ اسکے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے خوش ہوتی ہوگی اور سچ پوچھئے تو یہ عالمگیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اگر ہمیں اُس سے نہایت ہی بھونڈے طریقے پر نفرت کرنا سکھایا جاتا تو دُنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصور سے خالی ہوتی۔

میں نے عبدالرحمٰن سے نفرت کرنا شروع کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری اور اُس کی دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہوگئی۔ اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو کے باہر جہاں کہیں اُس سے میری ملاقات ہوتی میں اُس کی خیریت دریافت کرتا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا۔

عبدالرحمٰن کا قد متوسط ہے اور بدن گٹھا ہوا۔ جب وہ نیکر پہن کر آتا تو اُس کی بے بال پنڈلیوں کا گوشت فٹ بال کے نئے کورے چمڑے کی طرح چمکتا ہے ناک موٹی جس کی کوٹھڑی اُبھری ہوئی ہے

چہرے کے خطوط منگولی ہیں۔ ماتھا چوڑا جس پر گہرے زخم کا نشان ہے اسکو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شیطان لڑکے نے اپنے ڈسک کی لکڑی میں چاقو سے چھوٹا سا گڑھا بنا دیا ہے۔ پیٹ سخت اور ابھرا ہوا حافظ قرآن ہے۔ چنانچہ بات بات میں آیتوں کے حوالے دیتا ہے کمپنی کے دوسرے ایکٹر اُس کی اس عادت کو پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کہ انہیں احترام کے باعث چپ ہو جانا پڑتا ہے۔

ڈائرکٹر صاحب کو جب میری زبانی معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن صاف زبان بولتا ہے اور غلطی نہیں کرتا تو انہوں نے اُسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایک ہی فلم میں اُسے دس مختلف آدمیوں کے بھیس میں لایا گیا۔ سفید پوشاک پہنا کر اُسے ہوٹل میں بیرا بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سر پر لمبے لمبے بال لگا کر اور چمٹا ہاتھ میں دے کر ایک جگہ اس کو سادھو بنا دیا گیا۔ چپڑاسی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اُس کے چہرے پر گوند سے لمبی ڈاڑھی چپکا دی گئی۔ ریلوے پلیٹ فارم پر بڑی، مونچھیں لگا کر اس کو ٹکٹ چیکر بنا دیا گیا — یہ سب میری بدولت، ہوا، اس لیے کہ مجھے اس سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

عبدالرحمٰن خوش تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ اتنا مقبول ہو گیا اور میں خوش تھا کہ دوسرے ایکٹرا اُس سے حسد کرنے لگے ہیں۔ میں نے موقع دیکھ کر سیٹھ سے سفارش کی، چنانچہ تیسرے مہینے اُس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ بھی ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے پچیس ایکسٹراؤں کی آنکھوں میں وہ خار بن کے کھٹکنے لگا — لطف یہ ہے کہ عبدالرحمٰن کو اس بات کی مطلق خبر نہ تھی کہ میری وجہ سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے اور میری سفارشوں کے باعث کمپنی کے دوسرے ڈائرکٹر اُس سے کام لینے لگے ہیں۔

فلم کمپنی میں کام کرنے کے علاوہ میں وہاں کے ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کو ایڈیٹ کرتا ہوں۔ ایک روز میں نے اخبار، اپنا عبدالرحمن کے ہاتھ میں دیکھا جب وہ میرے قریب آیا تو مسکرا کر اُس نے پرچے کی ورق گردانی شروع کردی "منشی صاحب .... یہ رسالہ آپ ہی..

میں نے فوراً جواب دیا "جی ہاں"

"ماشاء اللہ، کتنا خوبصورت پرچہ نکالتے ہیں آپ ..... کل رات اتفاق سے یہ میرے ہاتھ آگیا....... بہت دلچسپ ہے، اب میں ہر ہفتے خریدا کروں گا۔

یہ اُس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ بات ختم ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد جبکہ میں اسٹڈیو کے باہر نیم کے پیڑ تلے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پہ بیٹھا اپنے اخبار کے لئے ایک کالم لکھ رہا تھا عبدالرحمن آیا اور بڑے ادب کیا تھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا فرمائیے"

"آپ فارغ ہو جائیں تو میں ......"

"میں فارغ ہوں —— فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے"

اس کے جواب میں اُس نے ایک رنگین لفافہ کھولا اور اپنی تصویر میری طرف بڑھادی۔ تصویر ہاتھ میں لیتے ہی جب میری نظر اُس پر پڑی تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی یہ ہنسی چونکہ بے اختیار آئی تھی۔ اس لئے میں اسے روک نہ سکا۔ بعد میں جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ عبدالرحمن کو یہ ناگوار معلوم ہوئی ہوگی تو میں نے کہا "عبدالرحمن صاحب اتفاق دیکھئے میں صبح سے پریشان تھا کہ ٹائیٹل پیج کے بعد کا صفحہ کیسے پر ہوگا۔ دو تصویروں کے بلاک مل گئے تھے۔ مگر ایک کی کمی تھی .... اسوقت بھی میں یہی

سوچ رہا تھا کہ آپ نے اپنا فوٹو میری طرف بڑھا دیا... بہت اچھا فوٹو ہے بلاک بھی اس کا خوب بنے گا۔"

عبدالرحمن نے اپنے موٹے ہونٹ اندر کی طرف سکیڑ لیے "آپ کی بڑی عنایت ہے..... تو..... کیا یہ تصویر چھپ جائے گی؟"

میں نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ کیوں نہیں اس ہفتے ہی کے لئے تو میں یہ کہہ رہا تھا۔"

اس پر عبدالرحمن نے دوبارہ شکریہ ادا کیا "پرچے میں تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹ نکل جائے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا...... جیسا آپ مناسب خیال فرما دیں...... تو ـــــ معاف کیجئے میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں۔"

یہ کہکر وہ اپنے ہاتھ آہستہ۔آہستہ ملتا ہوا چلا گیا۔

میں نے اب تصویر کو غور سے دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں بمبئی کی بھاری بھرکم ڈائرکٹری تھی جس پر چھپے ہوئے حروف بتا رہے تھے کہ سن سولہ کی یہ کتاب فوٹوگرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لئے ایک یا دو آنے میں خریدی ہوگی۔ دوسرے ہاتھ میں جو اوپر کو اٹھا ہوا تھا ایک بہت بڑا پائپ تھا۔ اس پائپ کی ٹونٹی عبدالرحمن نے اس انداز سے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا چائے کا پیالہ پکڑے ہے لبوں پر چائے کا گھونٹ پیتے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا کرتا ہے وہ تصویر میں اس کے ہونٹوں پر جما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں کیمرے کی طرف دیکھنے کے باعث کھل گئی تھیں ناک کے نتھنے تھوڑے سے پھول گئے تھے۔ سینے میں ابھار پیدا کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی کیونکہ وہ اچھا خاصا کارٹون بن گیا تھا۔ یاد رہے کہ عبدالرحمن انگریزی لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا ہے۔

میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اُس کے فوٹو کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ پرچے میں چھپوا دیا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کمپنی کے فلیٹ رستوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبدالرحمٰن تازہ پرچہ جس میں اسکی تصویر چھپی تھی۔ ہاتھ میں لئے داخل ہوا اور آداب عرض کر کے میرے پاس کھڑا ہو گیا اُس کے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے، آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑا رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے بغل میں پرچہ دبا کر اُس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے۔ شکریے کے کئی فقرے اس نے دل ہی دل میں بنائے ہونگے۔ مگر ناموزوں سمجھ کر انہیں منسوخ کر دیا ہوگا جب میں نے اُسے اُس اُدھیڑبُن میں دیکھا تو ماتم پُرسی کے انداز میں اُس سے کہا: "تصویر چھپ گئی آپ کی...... نوٹ بھی پڑھ لیا آپ نے؟"

"جی ہاں...... آپ...... کی بڑی نوازش ہے"

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی۔ میرا رنگ پیلا پڑ گیا یہ درد بہت پرانا ہے۔ جس کے دورے اکثر مجھے پڑتے ہیں میں اس کے دفعیے کے لئے سینکڑوں علاج کر چکا ہوں مگر لاحاصل چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اٹھا اور سارے سینے میں پھیل گیا۔ عبدالرحمٰن نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا: "آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے"

میں اُس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اس موذی مرض کا شکار ہوتے دیکھ سکتا، چنانچہ میں نے بڑے روکھے پن کے ساتھ کہا کچھ نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔

"جی نہیں، آپ کی طبیعت ناساز ہے ــــــــ" وہ سخت گھبرا گیا: "میں

میں آپ کی خدمت کرسکتا ہوں

"میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ مطلق فکر نہ کریں سینے میں معمولی سا درد ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"سینے میں درد ہے...... یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ سینے میں درد ہے تو...... تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپکو قبض ہے اور قبض......"

قریب تھا کہ میں بھنّا کر اُس کو دو تین گالیاں سنا دوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ "آپ...... حد کرتے ہیں۔ آپ...... سینے کے درد سے قبض کو کیا تعلق ہے؟"

"جی نہیں —— قبض ہو تو ایک سو ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہے —— آپ کی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپ کو پرانا قبض ہے اور جناب قبض کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو۔ جی نہیں، آپ جس کو با فراغت سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ قبض ہو...... سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں۔ قبض سے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے...... میرا خیال ہے کہ آپ ...... دراصل آپ کی کمزوری کا باعث بھی یہی قبض ہے۔"

عبدالرحمٰن چند لمحات کے لئے بالکل خاموش ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی اُس نے اپنے لہجہ میں زیادہ چکناہٹ پیدا کر کے کہا "آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہو گا —— ایک معمولی سا علاج میرا بھی دیکھئے —— خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دُور ہو جائے گا۔

میں نے پوچھا "کون سا مرض؟"

عبدالرحمٰن نے زور زور سے ہاتھ ملے "یہی...... یہی قبض!"

لاحول ولا۔ اس بیوقوف سے کس نے کہہ دیا مجھے قبض ہے، حرکت

میرے سینے میں درد رہتا ہے جو کہ بہت پرانا ہے اور سب ڈاکٹروں کا متفقہ رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے ۔ مگر یہ نیم حکیم خطرۂ جان برابر کہے جا رہا ہے ۔ کہ مجھے قبض ہے ۔ قبض ہے ، قبض ہے کہیں ایسا نہ ہو میں اس کے سر پر غصے میں آکر چائے کا پیالہ دے ماروں عجب نامعقول آدمی ہے ، اپنی طبابت کا پٹارہ کھول بیٹھا ہے اور سنتا ہی نہیں ۔

غصے کے باعث میں بالکل خاموش ہو گیا ۔ اس خاموشی کا عبدالرحمٰن نے فائدہ اٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا ۔ خدا معلوم اس نے کیا کیا کچھ کہا ......

"بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپ کے سدے پڑ گئے ہیں ۔ آپ کو روز اجابت تو ہو جاتی ہے مگر یہ سدے باہر نہیں نکلتے ۔ معدے کا فعل چونکہ درست نہیں رہا اس لئے انتڑیوں میں خشکی پیدا ہو گئی ہے رطوبت یعنی وہ لیسدار مادہ جو فضلے کو نیچے کھسکنے میں مدد دیتا ہے آپ کے اندر بہت کم ہو گیا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپ کو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہو گا ۔ قبض کھولنے کے لئے عام طور پر جو انگریزی مسہل دوائیں بازار میں بکتی ہیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں ، اس لئے کہ ان سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمائیے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لئے آپ کو دو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے ...... یونانی دوائیں اول تو ہم لوگوں کے مزاج کے موافق ہوتی ہیں دوسرے ...."

میں نے تنگ آ کر اس سے کہا "آپ چائے پئیں گے ؟" اور اس کا جواب سننے بغیر ہوٹل والے کو آرڈر دیا "گلاب ! ان کے لئے ایک ڈبل چائے لا دو ۔"

چائے فوراً ہی آگئی عبدالرحمٰن کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "معاف کیجئے گا، مجھے ڈائرکٹر صاحب کے سین کے متعلق بات چیت کرنا ہے۔ پھر گفتگو ہو گی!"

یہ سب کچھ اسقدر جلدی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبدالرحمٰن کی زبان پر منجمد ہو گئی اور ریستوران سے باہر نکل گیا۔ درد شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہو گئی تھی اس کی باتوں نے اس تکدر میں، اور بھی اضافہ کر دیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیونکر اس بات پر مصر ہے کہ مجھے قبض ہے۔ میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا کہ مدقوق ہوں جیسا کہ عام لوگ، میرے متعلق کہتے آئے ہیں وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے سل ہے میری انتڑیوں میں ورم ہے میرے معدے میں رسولی ہے، میرے دانت خراب ہیں مجھے گٹھیا ہے مگر بار بار اس کا اس بات پر زور دینا کیا معنی رکھتا تھا کہ مجھے قبض ہو رہا ہے یعنی اگر واقعی مجھے قبض تھا تو اس کا احساس مجھے پہلے ہونا چاہیے تھا نہ کہ حافظ عبدالرحمٰن کو ـــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنا رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں ڈائرکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھے ہیرو ولن اور تین چار ایکسٹریوں کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے آؤٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے باعث ملتوی کر دی گئی تھی۔ اس لئے سب کو چھٹی تھی۔ مجھے جب ہیرو کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گزر گئے۔ تو، معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمٰن کی باتیں ہو رہی ہیں میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ایک ایکسٹرا نے اُس کے خلاف کافی زہر اگلا۔ دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مضحکہ اڑایا۔ تیسرے نے اس کے مکالمے ادا کرنے کی نقل اُتاری۔ ہیرو کو حافظ عبدالرحمٰن کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اُس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے، ولن کو

ڈائرکٹر صاحب سے کہا۔ "بڑا واہیات آدمی ہے صاحب، کل ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ میرا بکٹنگ بالکل فضول ہے آپ اُس کو ایک بار ذرا ڈانٹ کر بتا دیجئے۔"

ڈائرکٹر صاحب مسکرا کر کہنے لگے "تم سب کو اُس کے خلاف شکایت ہے مگر اُسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے۔"

تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

ڈائرکٹر صاحب نے پہلی مسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا "وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ میں اُس کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ مجھے قبض وبض نہیں ہے لیکن وہ مانتا ہی نہیں، ابھی تک اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے کئی علاج بھی مجھے بتا چکا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اس طرح ممنون کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"یہ کہنے سے کہ مجھے قبض ہے اور اُس کا علاج بتانے سے ——— وہ مجھے ممنون ہی کرنا چاہتا ہے ورنہ پھر اُس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اُسے صرف اسی مرض کا علاج معلوم ہے یعنی اس کے پاس چند ایسی دوائیں موجود ہیں جن سے قبض دُور ہو سکتا ہے۔ چونکہ مجھے وہ خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے اس لیئے ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ جونہی مجھے قبض ہو وہ فوراً علاج شروع کر کے مجھے ٹھیک کر دے۔ آدمی دلچسپ ہے۔"

ساری بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا، "ڈائرکٹر صاحب ——— آپ کے علاوہ حافظ صاحب کی نظرِ عنایت خاکسار پر بھی ہے ——— میں نے کل ان کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے۔ اس احسان کا بدلہ اتارنے کیلئے ابھی ابھی ہوٹل میں انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے ...... خدا کا شکر ہے کہ میں اُن کے اس حملے سے

بچ گیا اس لئے کہ مجھے قبض نہیں ہے۔"

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے قبض ہوگیا۔ یہ قبض ابھی تک جاری ہے یعنی اس کو پورے دو مہینے ہوگئے ہیں میں کئی پیٹنٹ دوائیں استعمال کرچکا ہوں۔ مگر ابھی تک اس سے نجات حاصل نہیں ہوئی اب میں سوچتا ہوں۔ کہ حافظ عبدالرحمٰن کو اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک موقع دے ہی دوں کیا حرج ہے؟ — مجھے اُس سے محبّت تو ہے نہیں۔"

ایکٹریس کی آنکھ

"پاپیوں کی گٹھڑی" کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی۔ رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کے لئے خاص طور پر تیار کرایا تھا۔ اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹریس سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی سی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دور کرنے کے لئے ان ایکٹروں نے پی تھیں ان پیالیوں پر سبز کروں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سن کر کسی نو وارد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔

دراز قد ولن جو شکل و صورت سے لاہور کا کوچوان معلوم ہوتا تھا ریشمی سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ اور منہ بھی نیم وا تھا۔ مگر وہ کراہ رہا تھا اسی طرح اُس کے پاس ہی آرام کرسی پر ایک مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا ایکٹر اونگھ رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس ڈنڈے سے ٹیک لگائے ایک اور ایکٹر سونے کی کوشش میں مصروف تھا کمپنی کے مکالمہ نویس یعنی منشی صاحب ہونٹوں میں بیڑی دبائے اور ٹانگیں، میک اپ ٹیبل پر رکھے، شاید وہ گیت

بنانے میں مصروف تھے جو اُنھیں چار بجے سیٹھ صاحب کو دکھانا تھا۔

"اوئی، اوئی ... ... ہائے ... ... ہائے"

دفعتاً یہ آواز باہر سے اس چوبی کمرے میں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہوئی۔ ولن صاحب جھٹ سے اُٹھ بیٹھے اور اپنی آنکھیں ملنے لگے مونچھوں والے ایکٹر لمبے لمبے کان ایک ارتعاش کے ساتھ اس نسوانی آواز کو پہچاننے کے لیے تیار ہوئے۔ منشی صاحب نے ہیک اپ ٹیبل پر سے اپنی ٹانگیں اٹھالیں اور ولن صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

"اوئی، اوئی، اوئی ــــ ہائے ... ... ہائے"

اس پر، ولن، منشی اور دوسرے ایکٹر جو نیم غنودگی کی حالت میں تھے چونک پڑے، سب نے کاٹھ کے اُس بکس نما کمرے سے اپنی گردنیں، باہر نکالیں۔

"ارے کیا ہے بھئی"

"خیر تو ہے!"

"کیا ہوا؟"

"اماں، یہ تو ــــ دیوی ہیں!"

"کیا بات ہے! دیوی؟"

جتنے منہ اتنی باتیں ــــ کھڑکی میں سے نکلی ہوئی گردن بڑے اضطراب کے ساتھ متحرک ہوئی اور ہر ایک کے منہ سے گھبراہٹ میں ہمدردی اور ملے جلے استفسار کے جذبات اظہار ہوا۔

"ہائے، ہائے، ہائے ــــ اُوئی ما"

ــــ دیوی، کمپنی کی ہر دلعزیز ہیروئن کے چھوٹے سے منہ سے چیخیں نکلیں اور باہوں کو انتہائی کرب و اضطراب کے تحت ڈھیلا چھوڑ کر اُس نے اپنے

چپل پہنے پاؤں کو زور زور سے اسٹڈیو کی پتھریلی زمین پر مارتے ہوئے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

ٹھمکا ٹھمکا بوٗسا قد، گول گول گدریا ہوا ڈیل کھلتی ہوئی گندمی رنگت خوب خوب کالی کالی تیکھی بھویں، کھلی پیشانی پر گہرا کسوم کا ٹیکا —— بال کالے بھنورے سے جو سیدھی مانگ نکال کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کنگھی کئے ہوئے تھے، ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پر بیٹھی ہوئی ہیں۔

کنارے دار سفید سوتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی، چولی گجراتی تراشش کی تھی، بغیر آستینوں کے، جن میں سے جوبن پھٹا پڑتا تھا، ساڑھی بمبئی کی طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف میٹھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا —— گول گول کلائیاں جن میں کھلی کھلی جاپانی ریشمین چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں۔ ان ریشمین چوڑیوں میں کھلی ہوئی اِدھر اُدھر ولایتی سونے کی پتلی پتلی کنگنیاں جھم جھم کر رہی تھیں، کان موزوں اور لویں بڑی خوبصورتی کے ساتھ جھکی ہوئیں، جن میں ہیرے کے آویزے شبنم کی دو تھراتی ہوئی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں۔

چیختی چلاتی، اور زمین کو چپل پہنے پیروں سے کوٹتے، دیوی نے داہنی آنکھ کو نیچے سے سفید رومال کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔

"ہائے میری آنکھ —— ہائے میری آنکھ —————— ہائے!"

کاٹھ کے بکس سے باہر نکلی ہوئی کچھ گردنیں اندر کو ہو گئیں اور جو باہر تھیں، پھر سے ہلنے لگیں۔

"آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے؟"

"یہاں کنکر بھی بیشمار ہیں —— ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں"

"یہاں جھاڑو بھی تو چھ مہینے کے بعد دی جاتی ہے"

اندر آجاؤ، دیوی!"

"ہاں، ہاں، آؤ ——— آنکھ کو اس طرح نہ ملو۔"

"ارے بابا ——— بولا نہ تکلیف ہو جائے گی۔ تم اندر تو آؤ!"

آنکھ ملتی ملتی، دیوی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی۔

دلّن نے لپک کر تپائی پر سے بڑی صفائی کے ساتھ ایک رومال میں چائے کی پیالیاں سمیٹ کر میک اپ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے چھپا دیں اور اپنی پرانی پتلون سے ٹیبل کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ باقی ایکٹروں نے کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر جما دیں اور بڑے سلیقے سے بیٹھ گئے۔ منشی صاحب نے پرانی ادھ جلی بیڑی پھینک کر جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

دیوی اندر آئی۔ صوفے پر سے منشی صاحب اور دلّن اٹھ کھڑے ہوئے منشی صاحب نے بڑھ کر کہا: "آؤ، دیوی بیٹھو!"

دروازے کے پاس بڑی بڑی سیاہ و سفید مونچھوں والے بزرگ بیٹھے تھے، ان کی مونچھوں کے لٹکے اور بڑھے ہوئے بال تھرتھرائے اور انہوں نے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے گجراتی لہجہ میں کہا:۔ "ادھر بیسو!"

دیوی اُن کی تھرتھراتی ہوئی مونچھوں کی طرف دھیان دیئے بغیر آنکھ ملتی اور ہائے ہائے کرتی آگے بڑھ گئی۔ ایک نوجوان نے ہیرو سے جو معلوم ہو رہے تھے اور چھینٹی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ جھٹ سے ایک چوکی نما کرسی سرکا۔ آگے بڑھا دی۔ اور دیوی نے اُس پر بیٹھ کر اپنی ناک کے بانسے کو رومال سے رگڑنا شروع کر دیا۔

سب کے چہرے پر دیوی کی تکلیف کے احساس نے ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ منشی صاحب کی قوتِ احساس چونکہ دوسرے مردوں،

سے زیادہ تھی، اس لئے چشمہ ہٹا کر انہوں نے اپنی آنکھ ملنا شروع کر دی تھی

جس نوجوان نے کرسی پیش کی تھی اُس نے جھک کر دیوی کی آنکھ کا ملاحظہ کیا اور بڑے بڑے مفکرانہ انداز میں کہا "آنکھ کی مہرنی تپا رہی ہے۔ کہ تکلیف ضرور ہے"

ان کا لہجہ پھٹا ہوا تھا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ کمرہ گونج اٹھا۔

یہ کہنا تھا کہ دیوی نے اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور سفید ساڑھی میں اُس کی ٹانگیں اضطراب کا بے پناہ مظاہرہ کرنے لگیں۔

وتن صاحب آگے بڑھے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنی سخت کمر جھکا کر دیوی سے پوچھا "جلن محسوس ہوتی ہے یا چبھن!"

ایک اور صاحب جو اپنے سولا ہیٹ سمیت کمرے میں ابھی ابھی تشریف لائے تھے، آگے بڑھ کے پوچھنے لگے "پپوٹوں کے پیچھے رگڑ سی محسوس نہیں ہوتی؟"

دیوی کی آنکھ سُرخ ہو رہی تھی۔ پپوٹے ملنے اور آنسوؤں کی نمی کے باعث میلے میلے نظر آ رہے تھے چتونوں میں سے لال لال ڈوروں کی جھلک چک میں سے آفتاب غروب کا سُرخ سُرخ منظر پیش کر رہی تھی۔ داہنی آنکھ کی پلکیں نمی کے باعث بھاری اور گھنی ہو گئی تھیں۔ جس سے اُن کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ باہیں ڈھیلی کر کے دیوی نے دُکھتی آنکھ کی پتلی نچاتے ہوئے کہا:۔

"آں ... بڑا تکلیف ہوتی ہے ...... ہائے ..... اُوئی!" اور پھر سے آنکھ کو گیلے رومال سے ملنا شروع کر دیا۔

سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے جو کونے میں بیٹھے تھے، بلند آواز میں کہا "اس طرح آنکھ نہ رگڑو، خالی پیلی کوئی اور تکلیف ہو جائے گا۔"

"ہاں، ہاں..... ارے، تم پھر وہی کر رہی ہو،" پھٹی آواز والے نوجوان نے کہا۔

ولن جو فوراً ہی بیوی کی آنکھ کو ٹھیک حالت پر دیکھنا چاہتے تھے، بگڑ کر بولے "یہ تم سب بیکار باتیں بنا رہے ہو...... کسی سے ابھی تک یہ بھی نہیں ہوا کہ دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے...... اپنی آنکھ میں یہ تکلیف ہو تو پتہ چلے" یہ کہہ کر انہوں نے مڑ کر کھڑکی میں سے باہر گردن نکالی اور زور زور سے پکارنا شروع کیا "ارے...... کوئی ہے......... کوئی ہے...؟ گلاب؟ ۔ گلاب!"

جب اُن کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی تو انہوں نے گردن اندر کو کرلی اور بڑبڑانا شروع کر دیا "خدا جانے ہوٹل والے کا یہ چھوکرا کہاں غائب ہو جاتا ہے...... پڑا اونگھ رہا ہوگا۔ اسٹڈیو میں کسی تختے پر۔ مردود نابکار!" پھر فوراً ہی دور اسٹڈیو کے اُس طرف گلاب کو دیکھ کر چلائے، جو انگلیوں میں چائے کی پیالیاں لٹکائے چلا آ رہا تھا "ارے گلاب ۔۔۔ گلاب!"

گلاب بھاگتا ہوا آیا اور کھڑکی کے سامنے پہونچ کر ٹھیر گیا۔ ولن صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں اُس سے کہا "دیکھو! ایک گلاس میں پانی لاؤ، جلدی سے.... بھاگو!"

گلاب نے کھڑے کھڑے اندر جھانکا، دیکھنے کے لیے کہ یہ گڑبڑ کیا ہے ۔۔۔ اس پر ہیرو صاحب للکارے "ارے دیکھتا کیا ہے لانا گلاس میں تھوڑا سا پانی ۔۔۔۔ بھاگ کے جا، بھاگ کے جا!"

گلاب سامنے ٹین کی چھت والے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بیوی کی آنکھ میں چبھن اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور اُس کی بنارسی لنگڑے کی

کیری ایسی ننھی مُنی کٹوری روتے بچے کی طرح کانپنے لگی اور وہ اُٹھ کر درد کی شدت سے کراہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ دستی بڑے سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آئینہ نکال کر اُس نے اپنی دُکھتی آنکھ کو دیکھنا شروع کر دیا اتنے میں منشی صاحب بولے "یہ گلاب سے کہہ دیا ہوتا ——— پانی میں تھوڑی سی برف بھی ڈال لاتا لائے!"

"ہاں، ہاں سرد پانی اچھا رہے گا" یہ کہہ کر دولہن صاحب کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر چلائے "گلاب ——— ارے گلاب، پانی میں تھوڑی برف چھوڑ کے لانا"

اس دوران میں ہیرو صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے کہنے لگے "میں بولتا ہوں کہ رومال کو سانس کی بھاپ سے گرم کرو اور اُس سے آنکھ کو سینک دو کیوں دادا؟"

"ایکدم ٹھیک رہے گا!" سیاہ و سفید مونچھوں والے صاحب نے سر کو اس بات میں بڑے زور سے ہلائے کہا۔

ہیرو صاحب کھونٹیوں کی طرف بڑھے اپنے کوٹ میں سے ایک سفید رومال نکال کر دیوی کو سانس کے ذریعے سے اُس کو گرم کرنے کی ترکیب بتائی اور الگ ہو کر کھڑے ہو گئے دیوی نے رومال لے لیا اور اسے منہ کے پاس لے جا کر گال پھلا پھلا کر سانس کی گرمی پہونچائی۔ آنکھ کو ٹکور دی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

"کچھ آرام آیا؟" سولا ہیٹ والے صاحب نے دریافت کیا۔

دیوی نے روتی آواز میں جواب دیا "نہیں ...... نہیں ...... ابھی نہیں نکلا ...... میں مر گئی! ......"

اتنے میں گلاب پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ ہیرو اور دولہن دوڑ کر بڑھے اور دونوں نے مل کر دیوی کی آنکھ میں پانی چھوایا۔ جب گلاس کا پانی آنکھ

کو غسل دینے میں ختم ہو گیا، تو دیوی پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اور آنکھ جھپکانے لگی۔

"کچھ افاقہ ہوا؟"

"اب تکلیف تو نہیں ہے؟"

"کنکری نکل گئی ہو گی۔"

"بس تھوڑی دیر بعد آرام آجائے گا!"

آنکھ دُھل جانے پر پانی کی ٹھنڈک نے تھوڑی دیر کے لیے دیوی کی آنکھ میں چبھن رفع کر دی، مگر فوراً ہی پھر سے اُس نے درد کے مارے چلانا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے ایک صاحب باہر سے اندر آئے اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر معاملے کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔

نو وارد کہنہ سال ہونے کے باوجود چُست و چالاک معلوم ہوتے تھے۔ مونچھیں سفید تھیں، جو بیڑی کے دھوئیں کے باعث سیاہی مائل زرد رنگت اختیار کر چکی تھیں، اُن کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ فوج میں رہ چکے ہیں۔

سیاہ رنگ کی ٹوپی سر پر ذرا اس طرف ترچھی پہنے ہوئے تھے۔ پتلون اور کوٹ کا کپڑا معمولی اور خاکستری رنگ کا تھا۔ کولھوں اور رانوں کے اوپر پتلون میں پڑے ہوئے جھول اس بات پر چغلیاں کھا رہے تھے کہ ان کی ٹانگوں پر گوشت بہت کم ہے۔ کالر میں بندھی ہوئی میلی نکٹائی کچھ اسطرح نیچے لٹک رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ان سے روٹھی ہوئی ہے پتلون کا کپڑا گھٹنوں پر پھکر آگے بڑھا ہوا تھا، جو یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس بے جان، چیز سے بہت بڑا کام لیتے رہے ہیں۔ گال بڑھاپے کے باعث پچکے ہوئے

آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، جو بار بار شانوں کی عجیب جنبش کے ساتھ سکیڑ لی جاتی تھیں۔

آپ نے کاندھوں کو جنبش دی اور ایک قدم آگے بڑھ کر کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا "کنکر پڑ گیا ہے؟" اور اثبات میں جواب پا کر دیوی کی طرف بڑھے۔ ہیرو اور ولن کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کر کے آپ نے کہا۔ "پانی سے آرام نہیں آیا ——— خیر ——— رومال، ہے کسی کے پاس؟"

نصف درجن رومال اُن کے ہاتھ میں دیدیئے گئے۔ بڑے ڈرامائی انداز میں آپ نے ان پیش کردہ رومالوں میں سے ایک منتخب کیا، اور اُس کا ایک کنارا پکڑ کر دیوی کو آنکھ پر سے ہاتھ اٹھا لینے کا حکم دیا۔

جب دیوی نے اُن کے حکم کی تعمیل کی، تو انہوں نے جیب میں سے مداری کے سے انداز میں ایک چرمی بٹوا نکالا اور اُسمیں سے اپنا چشمہ نکال کر کمال احتیاط سے ناک پر چڑھا لیا۔ پھر چشمے کے شیشوں میں سے دیوی کی آنکھ کا دُور ہی سے اکڑ کر معائنہ کیا۔ پھر دفعتاً فوٹوگرافر کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے آپ نے اپنی ٹانگیں چوڑی کیں اور جب انھوں نے اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے دیوی کے پپوٹوں کو وا کرنا چاہا، تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ فوٹو لیتے وقت کیمرے کا لینس بند کر رہے ہیں۔

دو تین مرتبہ ڈرامائی انداز سے اپنے کھڑے ہونے کا رُخ بدل کر انہوں نے دیوی کی آنکھ کا معائنہ کیا اور پھر پپوٹے کھول کر بڑی آہستگی سے رومال کا کنارہ اُن کے اندر داخل کر دیا ———
حاضرین، خاموشی سے اس عمل کو دیکھتے رہے۔

پانچ منٹ تک کمرے میں قبر کی سی خاموشی طاری رہی - آنکھ صاف کرنے کے بعد اُسی ڈرامائی انداز میں فوٹوگرافر صاحب نے ...... چونکہ وہ بزرگ فوٹوگرافر ہی تھے ...... چشمہ اتار کر چرمی بٹوے میں رکھکر دیوی سے کہا "اب کنکر نکل گیا ہے - تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا ۔"

دیوی نے اُنگلیوں سے آنکھ کے پپوٹوں کو چھوا اور ننھا سا آئینہ نکال کر اپنا اطمینان کرنے لگی ۔

"کنکری نکل گئی نا ؟"

"اب درد تو محسوس نہیں ہوتا !"

"سالا ، اب نکل گیا ہوگا ---- بہت دکھ دیا ہے اُس نے !"

"دیوی ...... اب طبیعت کیسی ہے ؟"

یہ شور سنکر فوٹوگرافر صاحب نے کاندھوں کو زور سے جنبش دی اور کہا "تم سارا دن کوشش کرتے رہتے مگر کچھ نہ ہوتا ...... ہم فوج میں پچیس برس پہاڑ نہیں جھونکتا رہا ...... یہ سب کام جانتا ہے ...... کنکر نکل گیا ہے ، اب صرف جلن باقی ہے ، وہ بھی دور ، ہو جائے گی "

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیوی جو آئینے میں رونی صورت بنائے اپنا اطمینان کر رہی تھی ، ایکا ایکی مسکرائی اور پھر کھل کھلا کر ہنس دی ---- چوبی کمرے میں مترنم تارے بکھر گئے ۔

"اب آرام ہے ...... اب آرام ہے" یہ کہہ کر دیوی سیٹھ کی جانب روانہ ہوگئی ، جو ہوٹل کے پاس اکیلا کھڑا تھا ، اور سب لوگ دیکھتے رہ گئے ۔

ہیرو جب صوفے پر بیٹھنے لگا تو منشی صاحب کی ران نیچے دب

گئی - آپ بھنا گئے "اب کیا پھر سونے کا ارادہ ہے - چپلو بیٹھو،
مجھے کل والے سین کے ڈائلاگ سنا دو"
ہیرو کے دماغ میں اُس وقت کوئی اور ہی سین تھا -

وہ خط جو پوسٹ نہ کئے گئے

حوا کی ایک بیٹی کے چند خطوط جو اُس نے فرصت کے وقت محلے کے چند لوگوں کو لکھے۔ مگر اُن کی وجوہ کی بنا پر پوسٹ نہ کئے گئے۔ جو ان خطوط میں نمایاں نظر آتی ہیں

(نام اور مقام فرضی ہیں)

پہلا خط مسز کریلانی کے نام

خاتونِ مکرم

آداب عرض۔ معاف فرمائیے گا۔ میں یہ سطور بغیر تعارف کے لکھ رہی ہوں۔ مگر چند ضروری باتیں مجھے آپ سے کہنا ہیں۔ آپ کو میں ایک عرصے سے جانتی ہوں ہر روز صبح ساڑھے آٹھ بجے جب میں بستر سے اٹھ کر بالکنی میں آتی ہوں تو آپ کو بازار میں سیر سے واپس آتے دیکھا کرتی ہوں۔ مجھے تعجب ہے کہ مسٹر کریلانی جنہیں، ساڑھے آٹھ بجے گھر سے دفتر پہنچنے کے لئے نکل جانا ہوتا ہے۔ صرف ایک بڈھی نوکرانی کی موجودگی اور آپ کی غیر حاضری میں ناشتہ کیسے کرتے ہیں کپڑے کیوں تبدیل کرتے ہیں اور پھر آپ کا بچہ بھی تو ہے اُس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیر آپ کی صحت کے لئے مفید ہے۔ اس سیر کا اثر آپ کے شوہر پر کیا پڑے گا، کیا آپ نے اس کی بابت کچھ غور کیا ہے؟ میں نے پرسوں مسٹر کرپلانی کو دیکھا اُن کی حالت قابلِ رحم تھی۔ آپ نے سر پر ہیٹ اُلٹا رکھا تھا۔ اور اگر میری نگاہوں نے دھوکہ نہیں دیا۔ تو اُن کے بوٹ کا ایک تسمہ کھلا ہوا تھا۔ جو بار بار اُن کے پاؤں میں اُلجھ رہا تھا۔ کل بھی آپ کی حالت ایسی ہی تھی اُن کی پتلون شکنوں سے بھرپور تھی اور ٹائی کی گرہ بھی درست نہیں تھی۔

اگر آپ کی صبح کی سیر اسی طرح جاری رہی تو مجھے اندیشہ ہے ایک روز مسٹر کرپلانی اس افراتفری میں دفتر کا رُخ کریں گے۔ کہ راہ چلتی عورتوں کو اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں گی۔

اور ہاں، دیکھئے کل آپ نے جو ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ آپ کی نہیں ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسز اڈوانی نے یہ ساڑھی پچھلی دیوالی پر خریدی تھی دوسروں کے کپڑے پہننا بہت معیوب ہے۔ آپ کے پاس کم از کم بیس ساڑیاں موجود ہیں۔ مسز اڈوانی کی ساڑھی مستعار لے کر آپ نے کیوں پہنی۔ یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔

ایک بات اور۔ وہ یہ کہ آپ کو بغیر آستینوں کا بلاؤز اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کے کاندھوں پر ضرورت سے زیادہ گوشت ہے جس کی نمائش آنکھوں پر بہت گراں گزرتی ہے۔ آپ کے جسم پر یہ عیب آستینوں والے بلاؤز میں چھپ جاتا ہے۔ اس لئے آپ کو ہمیشہ اسی تراش کا بلاؤز پہننا چاہئے!

اونچی ایڑی کا شو آپ کیوں پہنتی ہیں؟ — آپ کا قد ماشاءاللہ کافی اونچا ہے۔ پرسوں آپ نے غیر معمولی اونچی ایڑی کا سینڈل پہن رکھا تھا

معاف فرمایئے۔ معلوم ہوتا
ہوئے ہیں۔ اونچی ایڑی کا ج
خواہ مخواہ کیوں اپنے آپ کو

دوسرا خط مسز اڈوا

محترمی

تسلیمات
میلے پر چند سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا آپ نے
ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بورڈر کے بغیر بلاؤز کالی ساٹن
کے بغیر گلے پر زرد رنگ کی ساٹن کا پائپنگ تھا اور سا
کا پھول۔ پاؤں میں آپ کے سنہری سینڈل تھی چھاتا سیاہ
کی موٹھ زرد رنگ کے سلولائیڈ کی تھی ــــ کالے بالوں میں
اور زردی کا یہ میل مجھے بہت پسند آیا تھا۔ آپ کے ذوق کی میں
ہوں رنگوں کے صحیح التزام کا آپ خوب سلیقہ رکھتی ہیں۔ مگر کل آپ
بس پر سے اتریں تو مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ آپ نے کالی
کے ساتھ بھورے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا ہے۔ آپ کے بالوں میں نیلا
ربن گندھا ہے اور جوتا سفید کینوس کا پہن رکھا ہے۔
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی اعلیٰ ذوق رکھنے والی خاتون
نے کیوں کر ایسے بھونڈے لباس میں باہر نکلنا گوارا کیا اور پھر غضب
یہ ہے کہ آپ بس میں کیسے سوار ہو گئی تھیں۔ آئندہ اگر میں نے آپ کو ایسے بے تکے لباس
میں دیکھا تو مجھے اتنا صدمہ ہوگا کہ میں بیان نہیں کر سکتی ــــ

که آپ کی نوکرانی اتنا سنگھار
ہے کے مطابق اٹھارہ برس ہے
س کر کنوار پنے میں اُن کا یوں بن
اتنا خطرناک نہیں۔ جتنا کہ اُس کا
ا ہے آپ عموماً گھر سے باہر رہتی ہیں
اس لیئے وہ اکثر گھر ہی میں رہتے ہیں۔
ھ گئی ہے میں اس سے زیادہ اور کچھ

پ کی دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے)
پہنا کریں تو عیب بالکل دُور ہو جائے گا۔ کیونکہ شیشوں
رق نظر نہ آئے گا۔
پ سہیلیوں کو اپنی ساڑھیاں پہننے کے لیئے، کیوں دے
۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بدعت معاشرتی
ے بری ہے۔ اس کے علاوہ سہیلیاں خواہ کتنی ہی محتاط
ستعار کپڑے کو نہایت بے دردی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں، اگر
و یقین نہ ہو تو اُس سفید ساڑھی کو غور سے دیکھیئے۔ جو آپ نے ایک
وز مسز کرپلانی کو پہننے کے لیئے دی تھی۔ اس کا تلّے کا کام کئی جگہ سے
اکھڑ گیا ہے۔
بازار میں چلتے وقت آپ بار بار ساڑھی کا پلّو نہ سنبھالا کریں۔
مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

آپ کی .... خادم سنگھار کی ماسٹر

گگن نالہ

تیسرا خط مسٹر ~~بیب خان~~ انسپکٹر پولیس کے نام

مکرمی محترمی۔ سلام مسنون

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ دن میں دو بار اپنی ڈاڑھی منڈوانا چھوڑ دیں —— میں سمجھتی ہوں کہ نارمل آدمی کی ڈاڑھی کے بال نارمل حالت میں اتنے جلدی کبھی نہیں اُگتے۔ پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے اور وہاں سے شام کو آتے ہوئے آپ کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ سیلون میں داخل ہو جائیں۔ میرا خیال ہے کہ MANIA آپ کو ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا دماغ توازن درست ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دن میں دو بار صبح و شام اپنی ڈاڑھی پر اُسترا پھروائیں، کیا سیلون کا نائی آپ کی اس عجیب و غریب عادت پر زیرِ لب کبھی نہیں مسکرایا؟

اور پھر یہ آپ اپنے سر کے بال کس طور سے کٹواتے ہیں؟ —— واللہ بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ گردن سے لے کر کھوپڑی کے بالائی حصے تک آپ بالوں کا بالکل صفایا کرا دیتے ہیں اور کانوں کے اوپر تک باریک مشین پھروا کر آخر آپ کیا فیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت آپ کی گردن بہت بھدی ہے اور آپ کے سر کے نچلے حصے پر پھوڑوں کے نشان ہیں جو صرف بال ہی چھپا سکتے ہیں اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ بار بار مونڈ لینے سے آپ کی گردن موٹی ہو جائے گی!

آپ کے کان بہت بڑے ہیں۔ جس فیشن کی حجامت کا آپ کو شوق ہے اُس سے یہ اور بھی زیادہ بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ قلمیں رکھیں اور کانوں کے قریب سے بال زیادہ نہ کٹوائیں؛ گردن پر اگر آپ تھوڑے سے بال اُگنے دیں تو کوئی حرج نہیں۔ اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

(~~بڑے کان~~) بجست کان

ہاتھ میں چھڑی لے کر جب آپ بازار میں چلتے ہیں تو دماغ میں اس خیال کو جگہ نہ دیا کریں کہ ہر اسکول کی جانے والی لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے کسی شائستہ مذاق لڑکی کی آنکھیں آپ کی طرف نہیں اُٹھ سکتیں اس لئے کہ آپ اپنے کندھوں پر ایسا بھونڈا سر اٹھائے پھرتے ہیں جس کو آپ کے ایجاد کردہ فیشن نے اور بھی زیادہ بدنما بنا رکھا ہے۔

بار بار آپ اپنے کوٹ سے کیا جھاڑا کرتے ہیں؟ کیا گرد و غبار کے ذرّے صرف آپ ہی کے کوٹ پر آ بیٹھتے ہیں.... یا پھر آپ حد سے زیادہ نفاست پسند ہیں؟

کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ چالیس برس کے ہونے پر بھی آپ کنوارے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اس سے آپ کو عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔ میرا مشورہ لیجئے۔ اور دن میں دو بار سیلون میں جا کر ڈاڑھی منڈوانا چھوڑ دیجئے۔ خدا آپ کی حالت پر رحم کرے۔

آپ کی مخلص۔ [illegible]

چوتھا خط مس ڈوی سلوا کے نام

ڈیر مس ڈی سلوا۔

تمہاری حالت پر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ تم روز بروز موٹی ہو رہی ہو۔ اگر تمہارا موٹاپا اسی رفتار سے بڑھتا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تم کسی مرد کے قابل نہ رہو گی۔ اسکول جانے کے لئے جب تم "جم" پہن کر گھر سے نکلتی ہو تو میرے دل میں عجیب و غریب خیال پیدا ہوتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اس کرسمس پر تم ڈانس کیسے کر سکو گی ایک دو قدموں ہی میں تمہارا پسینہ چھوٹ جائے گا۔ اور تمہارا ساتھی کیونکر تمہاری باہوں کو حسب منشا حرکت میں لا سکے گا۔ تمہاری بغلوں

کے نیچے اس قدر گوشت جمع ہو رہا ہے کہ تم ڈانس کرنے کے بالکل قابل نہیں رہی ہو خدا کے لئے اپنا علاج کرو اور اس موٹاپے کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت بیٹھی ہوگی۔

ایک نصیحت میری اور سن لو۔ شام کو تم ہر روز ٹیرس پر اکیلی جاتی ہو اور سامنے والے مکان پر ڈی کوسٹا کے بڑے لڑکے کو اشارے کرتی رہتی ہو۔ اوّل تو یہ شریف لڑکیوں کا کام نہیں۔ دوسرے یہ اشارے چربی بھرے گوشت کے مانند بھدّے اور بے لذت ہوتے ہیں۔ تم جیسی موٹی لڑکیوں کو ایسی اشارہ بازی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ اشارہ ایک لطیف یعنی باریک اور پتلی چیز کا نام ہے۔ تمہارے اشارے، اشارے نہیں ہوتے۔ ان کے لئے مجھے کوئی اور نام تلاش کرنا ہوگا۔

جس لونڈے کے ساتھ تم رومان لڑانا چاہتی ہو۔ اس کے متعلق بھی سن لو وہ ایک آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ ڈھائی مہینے سے کالی کھانسی میں مبتلا ہے۔ ماں باپ نے ناقابلِ اصلاح سمجھ کر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے پاس صرف تین پتلونیں ہیں جن کو بدل بدل کر پہنتا ہے۔ ہر روز اپنی قمیض اور پتلون پر دوبارہ استری کرتا ہے۔ تاکہ باہر کے لوگوں کی نظر میں اس وضع داری قائم رہے۔ مجھے ایسے آدمیوں سے نفرت ہے۔

تم اپنی پنڈلیوں کے بال استرے سے نہ مونڈا کرو۔ بال اڑانے کے سب پوڈر اور سب کریمیں بھی فضول ہیں۔ بال ہمیشہ کے لئے کبھی غائب نہیں ہو سکتے اس لئے تم اپنی پنڈلیوں پر ظلم نہ کرو بال رہنے دو۔ لمبی جرابیں پہنا کرو۔

تمہارا دوست آج دوپہر کو اپنا پھٹا ہوا جوتا خود مرمت کر رہا تھا!

تمہاری خیر خواہ۔ ببب۔ کی دادی

پانچواں خط کوشلیا دیوی کے نام۔

شریمتی کوشلیا دیوی۔ نمسکار

اس میں کوئی شک نہیں۔ اپنے گھر میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ آرام دہ سے آرام دہ لباس پہنے اور تکلفات سے آزاد ہے۔ مگر دیوی جی آپ ململ کی باریک دھوتی پہن کر اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھارہی ہیں اور پھر یہ دھوتی آپ کچھ اس "بے تکلفی" سے پہنتی ہیں کہ جب آپ اتفاق سے نظر آجائیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ آپ کو کس زاویے سے دیکھا جائے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ روشنی کے سامنے کھڑے ہونے سے آپ کی ململ کی دھوتی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے آپکی عمر اس وقت چوالیس برس کے قریب ہے عمر کی اس زیادتی نے آپکے جسم کو بالکل ڈھیلا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باریک دھوتی میں سے آپ کی بھدی ٹانگوں کی نمائش آنکھوں پر گویا "جنجی" بنکر رہ جاتی ہے۔

آپ کے فلیٹ کا دروازہ عام طور پر کھلا رہتا ہے اور میں نے اکثر آپ کو باورچی خانہ کے پاس یہی باریک دھوتی پہنے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو اس کا استعمال ترک نہیں کرنا ہے تو براہِ کرم اپنے فلیٹ کا دروازہ بند رکھا کریں۔

آپ کی ......

چھٹا خط مسٹر سعید حسن جرنلسٹ کے نام۔

جنابِ من تسلیم۔

آپ ہر روز صبح بالکونی میں پتلون پہنتے ہیں۔ آپ کا یہ فعل کمیونزم

کی بدترین مثال ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خط آپ پڑھ کر ضرور شرمسار ہوں گے اور آئندہ سے پتلون شریف آدمیوں کی طرح اپنے کمرے میں پہنا کرینگے۔

مخلص

مکرر۔ آپ کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ سیلون آپ کے مکان کے نیچے ہے۔ ہمت کر کے آج ہی کٹوا دیں۔

ساتواں خط مسز قاسمی کے نام

خاتونِ مکرم۔ السلام علیکم

میں بہت عرصہ سے آپ کو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ مگر چند در چند وجوہ کے باعث ایسا نہ کر سکی۔ میں نے سنا ہے کہ دو گھروں میں نفاق پیدا کرنے کے لئے آپ کو بہت سے گُر زبانی یاد ہیں۔ مسز اڈوانی اور مسز کرپلانی کے درمیان ایک دفعہ آپ ہی کی کوششوں سے رنجش پیدا ہوئی تھی۔ اور پچھلے دنوں سیٹھ گوپال داس کی لڑکی پشپا کے بارے میں آپ نے جو افواہیں مشہور کی تھیں۔ انہی سے سیٹھ گوپال داس اور سیٹھ رام داس کے خاندانوں میں اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مجھے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے مگر میں سوچتی ہوں کہ ابھی تک آپ کے اور مسز قانون گو کے درمیان کشیدگی پیدا کیوں نہیں ہوئی۔ اب تک آپ نے جس عورت کو اپنی سہیلی بنایا ہے اس سے تیسرے چوتھے مہینے آپ کی تُو تُو میں میں ضرور ہوئی ہے لیکن مسز قانون گو سے آپ کی دوستی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں جو کئی برسوں کے برابر ہیں۔ میں اب زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی۔ اس مہینے میں مسز قانون گو سے آپکی چخ چخ ضرور ہو جانی چاہئے۔ آپ کو اپنی روایات برقرار رکھنی چاہئیں۔

ہاں یہ ضرور بتائیے کہ آپ کہاں پیدا ہوئی تھیں یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ پنجاب کی رہنے والی ہیں۔ مگر آپ کا چہرہ نیپالیوں اور تبتیوں سے کیوں

ملتا جلتا ہے؛ آپ کی ناک بالکل نیپالیوں کی طرح چپٹی ہے اور گالوں کی ہڈیاں بھی انہی کی طرح ابھری ہوئی ہیں۔ البتہ آپ کا قد ان کی طرح پست نہیں۔

آپ نے عید پر جو ساڑھی پہنی تھی۔ مجھے پسند نہ آئی۔ آپ کا ذوق نہایت فضول ہے۔ اگر آپ بھڑکیلے اور شوخ رنگوں کے بجائے ہلکے رنگ کے کپڑے انتخاب کیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ لمبے قد کی عورتوں کو کھڑی لکیروں کی قمیضیں نہیں پہننی چاہیے اس سے وہ اور لمبی ہو جاتی ہیں اسی طرح آپ کو لیٹ سلیوزا کلا بلاؤز بھی نہیں پہننا چاہیے۔ کیونکہ لمبے قد کی عورتوں کے لیے یہ موزوں، نہیں ہوتا۔ اور پھر آپ تو ویسے ہی دُبلی پتلی ہیں۔ آپ کے کاندھے پر بلاؤز کے اٹھے ہوئے "پف" بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کی خیر اندیش......

آٹھواں خط مس راجکماری ایکٹرس کے نام۔

مس راجکماری

مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم عورت نہیں ہو، سوٹ کیس ہو

تم سے نفرت کرنے والی......

نواں خط مسٹر صالح بھائی کنٹریکٹر کے نام

جناب صالح صاحب۔ تسلیم

مجھے آپ کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ لیکن پھر بھی میں آپ کو پسند نہیں کرتی نہ معلوم کیا وجہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں غیظ و غضب پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ بہت شریف آدمی ہیں آپ کی شکل و صورت بھی کوئی خاص بُری نہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر آپ کو میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہوں...... آپ کے چہرے پر یتیمی برستی ہے، آپ کی چال

بھی نہایت واہیات ہے

آپ کی ہمدرد... فریدہ

دسواں خط مس رضیہ صلاح الدین کے نام۔

ڈیر مس رضیہ۔ سلام مسنون۔

تم ابھی ابھی پنجاب کے کسی گاؤں سے آئی ہو۔ پہلے ساڑھی پہننے کی عادت اختیار کرو، پھر اس لباس میں باہر نکلو۔ تمہیں یہ لباس پہننے کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو تماشہ نہ بناؤ۔

تمہاری خیر خواہ پیارے جہاں کی بیوی

مصری کی ڈلی

پچھلے دنوں میری روح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ روح اس لئے کہ میں نے دفعتہً اپنے ماحول کی خوفناک ویرانی کو محسوس کیا تھا اور جسم اس لئے کہ میرے تمام پٹھے سردی لگ جانے کے باعث چوبی تختے کے مانند اکڑ گئے تھے۔ دس دن تک میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا رہا.... پلنگ —— اُس چیز کو پلنگ ہی سمجھ لیجئے جو لکڑی کے چار بڑے پایوں پندرہ بیس چوبی ڈنڈوں اور ڈیڑھ دو من وزنی مستطیل آہنی چادر پر مشتمل ہے۔ لوہے کی یہ بھاری بھرکم چادر نواڑ اور سُوتلی کا کام دیتی ہے۔ اس پلنگ کا فائدہ یہ ہے کہ کھٹمل دُور رہتے ہیں اور یوں بھی کافی مضبوط ہے یعنی صدیوں تک قائم رہ سکتا ہے۔

یہ پلنگ میرے پڑوسی سلیم صاحب کا عنایت کردہ ہے۔ میں زمین پر سوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے یہ پلنگ جو انہیں کمرے کے ساتھ ملا تھا مجھے دے دیا۔ تاکہ میں سخت فرش پر سونے کے بجائے لوہے کی چادر پر آرام کروں۔ سلیم صاحب اور ان کی بیوی کو میرا بہت خیال ہے اور میں اُن کا بہت ممنون ہوں اگر میں معمولی سے معمولی چارپائی بھی بازار سے لیتا تو کم از کم چار پانچ روپے خرچ ہو جاتے۔

خیر، چھوڑیئے اِس قصے کو۔ میں یہ بات کر رہا تھا کہ پچھلے دنوں میری، روح اور میرا جسم دونوں علیل تھے۔ دس دن اور دس راتیں میں نے ایسے خلا میں بسر کیں جس کی تفصیل میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کہیں لٹکا ہوں۔ لوہے کے پلنگ پر لیٹے لیٹے یوں بھی میرا جسم شل ہو گیا تھا۔ دماغ ویسے ہی منجمد تھا جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں میں کیا عرض کروں، میری کیا حالت تھی۔

دس دن اُس ہیبت ناک خلا میں رہنے کے بعد میرے جسم کی علالت دُور ہو گئی۔

دس بجے کا عمل تھا۔ دُھوپ سامنے کارخانے کی بلند چمنی سے پہلو بچاتی، کمرے کے فرش پر لیٹ رہی تھی۔ میں لوہے کے پلنگ پر سے اُٹھا تھکے ہوئے جسم میں انگڑائی سے حرکت پیدا کرنے کی کوشش کے بعد جب میں نے کمرے نگاہ دوڑائی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کمرہ وہ نہیں تھا۔ جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دائیں ہاتھ کونے میں ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا میز ہمارے کمرے میں ہوا کرتا تھا۔ مگر اُس کا پالش اتنا چمکیلا کبھی نہیں تھا اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی اُس میں اتنی خوبیاں میں نے کبھی میں نے نہیں دیکھی تھیں۔ کمرے کے وسط میں جو بڑا میز پڑا رہتا تھا وہ بھی مجھے نا مانوس معلوم ہوا۔ اُس کا بالائی ہشت پہلو تختہ چمک رہا تھا دیوار پر پانچ چھ تصویریں آویزاں تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں

ان میں سے ایک تصویر میری نگاہ میں جم گئی۔ میں بڑھا اور اُس کو قریب سے دیکھا۔ جدید فوٹوگرافی کا بہت عمدہ نمونہ تھا۔ ہلکے بھوسلے رنگ کے کاغذ پر ایک جواں سال لڑکی کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے اور کانوں پر سے اِدھر کو اُڑ رہے تھے۔ سینہ سامنے سے ناف تک کے ننھے سے دباؤ تک ننگا۔ اِس نرم و نازک

عریانی کو اُس کی گوری باہیں جو اُس کے چہرے تک اٹھی ہوئی تھیں، چھپا لینے کی دلچسپ کوشش کر رہی تھیں۔ پتلی پتلی بیلے بلیے ناخنوں والی انگلیوں میں سے چہرے کی حیا چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ کہنیوں نے نیچے سے پیٹ کے اختتامی خط پر آپس میں جڑ کر ایک دلکش تکون بنا دی تھی۔ جس میں سے ناف کا گدگدا گڑھا جھانک رہا تھا۔ اگر اس چھوٹے سے گڑھے میں ڈنڈی گاڑ دی جاتی تو اُس کا پیٹ سیب کا بالائی حصّہ بن جاتا۔

میں دیر تک اس نیم عُریاں و نیم مستور شباب کو دیکھتا رہا مجھے حیرت تھی کہ یہ تصویر کہاں سے آ گئی۔ اسی حیرت میں غرق میں غسل خانے کی طرف بڑھا۔ کمرے کے چوتھے کونے میں نل کے نیچے فرش میں سل لگی ہوئی ہے اس کے ایک طرف چھوٹی سی منڈیر بنا دی گئی ہے یہ جگہ جہاں جست کی ایک بالٹی، صابن دانی، دانتوں کے دو برش، داڑھی مونڈنے کے دو اُسترے صابن لگانے کی دو کوچیاں، منجن کی بوتل اور پانچ چھ استعمال شدہ اور زنگ آلود بلیڈ پڑے رہتے ہیں۔ ہمارا غسل خانہ ہے۔ منذیر صاحب جن کا یہ کمرہ ہے علی الصبح بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ چنانچہ داڑھی مونڈ کر وہ فوراً ہی غسل سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ میں سویا رہتا ہوں اور وہ مزے سے ننگے نہاتے رہتے ہیں۔

اس غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر تمام چیزوں پر نگاہ دوڑائی۔ اب مجھے وہ کسی قدر مانوس معلوم ہوئیں۔ منڈیر پر میرا استرا اور گھسا ہوا برش اسی طرح پڑا تھا جس طرح میں روز دیکھا کرتا تھا، بالٹی بھی بلا شک و شبہ وہی تھی جو ہر روز نگاہوں کے سامنے آتی تھیں۔ اُس میں ڈونگا بھی وہی تھا جس میں جابجا گڑھوں میں میل جما رہتا تھا۔

منڈیر پر بیٹھ کر جیب میں نے برش سے دانت گھسنے شروع کئے تو

میں نے سوچا کمرہ وہی ہے جس میں ایک سو بیس راتیں میں گذار چکا ہوں۔ راتیں میں نے غور کیا ـــــ معاملہ صاف ہو گیا۔ کمرے اور اس کی اشیاء کے نا مانوس ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس میں صرف ایک سو بیس راتیں ہی گذاری تھیں صبح سات یا آٹھ بجے جلدی جلدی کپڑے بدل کر جو میں ایک دفعہ باہر نکل جاتا تو پھر رات کو گیارہ بارہ بجے کے قریب ہی لوٹنا ہوتا تھا اس صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ مجھے کمرے کی ساخت اور اس پر پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملتا اور پھر نہ کمرہ میرا ہے اور نہ اس کی کوئی چیز میری ملکیت ہے اور یہ بھی تو سچی بات ہے کہ بڑے شہر انسانیت کے مرقد و مدفن ہوتے ہیں۔

میں جس ماحول میں چار مہینے سے زندگی بسر کر رہا ہوں، اس قدر یکساں اور ایک آہنگ ہے کہ طبیعت ہار ہار کر اکتا گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ شہر چھوڑ کر کسی ویرانے میں چلا جاؤں، صبح جلدی جلدی نہانا۔ پھر عجلت میں کپڑے پہن کر دفتر میں کاغذ کالے کرتے رہنا، ہاں وہاں سے شام کو فارغ ہو کر ایک اور دفتر میں چھ سات گھنٹے اسی اکتا دینے والے کام میں مصروف رہنا اور رات کے گیارہ بارہ بجے اندھیرے ہی میں کپڑے اتار کر سلیم کے دئے ہوئے آہنی پلنگ سونے کی کوشش کرنا ـــــ کیا یہ زندگی ہے!

زندگی کیا ہے؟ ـــ یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو اُدھیڑتے رہتے ہیں۔ جب اُدھیڑتے اُدھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائے گا۔

جب زندگی کے لمحات کٹتے محسوس ہوں اور حافظے کی تختی پر کچھ نقش چھوڑ جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آدمی زندہ ہے اور اگر مہینوں گذر جائیں

اور یہ محسوس تک نہ ہو کہ مہینے گذر گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ "انسان کی حیات مردہ ہو گئی ہیں زندگی کی کتاب میں اگر اوپر تلے خالی اوراق ہی شامل ہوتے چلے جائیں تو کتنا دکھ ہوتا ہے دوسروں کو بھی اِس کا احساس ہوتا ہے یا کہ نہیں، اس کی بابت میں، کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں تو اس معاملے میں بہت حساس ہوں۔(زندگی کی یہ خالی کاپی جو ہمارے ہاتھ میں تھمائی گئی ہے آخر اسی لئے تو ہے کہ اُس کے ہر ورق کو ہم استعمال کریں، اس پر کچھ لکھیں۔ لیکن افسوس بات کا ہے کہ مجھے کوئی ایسی بات ہی نہیں ملتی جس کے متعلق میں کچھ لکھوں۔۔لے دے کے میری اس کاپی میں صرف دو تین ورق ایسے ہیں جن پر میں نقش و نگار بنے دیکھتا ہوں۔ یہ ورق مجھے کتنے عزیز ہیں۔اگر آپ ان کو نوچ کر باہر نکال دیں۔ تو میری زندگی ایک بیابان بن جائے گی۔ آپ یقین کیجئے میری زندگی واقعی چٹیل میدان کی طرح ہے جس میں اُن بیتے ہوئے دنوں کی یہ سہانی یاد ایک خوبصورت قبر کی طرح لیٹی ہوئی ہے چونکہ میں نہیں چاہتا کہ اچھے دنوں کی یہ سہانی رات مٹ جائے۔ اس لئے میں اس قبر پر ہر وقت مٹی کا لیپ کرتا رہتا ہوں،

میرے سامنے دیوار پر ایک پرانا کلینڈر لٹک رہا ہے۔ جس کے میلے کاغذ پر چیڑ کے لانبے لانبے درختوں کی تصویر چھپی ہے۔ میں اسے ایک عرصہ سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں اس کے پیچھے، دور بہت دُور، مجھے اپنی زندگی کے کھوئے ہوئے ٹکڑے کی جھلک نظر آ رہی ہے۔

میں ایک پہاڑی کے دامن میں چیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھا ہوں۔ بیگو بڑے بھولے پن سے گھٹنے ٹیک کر اپنا سر میرے قریب لاتی ہے اور کہتی ہے آپ مانتے ہی نہیں —— سچ میں بوڑھی ہو گئی ہوں، اب بھی یقین نہ آئیگا

"یہ لیجئے میرے سر میں سفید بال دیکھ لیجئے۔"

چودہ برس کی دیہاتی فضا میں پلی ہوئی جوان لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں معلوم نہیں کہ وہ کیوں اس بات پر زور دینا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ مجھ سے یہی بات کہہ چکی تھی میرا خیال ہے کہ جوان آدمی کو شباب کے دائرے سے نکل کر بڑھاپے کے دائرے میں داخل ہونے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ میرے دل میں بھی اس قسم کی خواہش کئی بار پیدا ہو چکی ہے میں نے متعدد بار سوچا ہے کہ میری کنپٹیوں پر اگر سفید سفید بال نمودار ہو جائیں تو چہرے کی متانت اور سنجیدگی میں اضافہ ہو جائے گا۔ کنپٹیوں پر اگر سفید بال ہو جائیں تو چاندی کے مہین تاروں کی طرح چمکتے ہیں اور دوسرے سیاہ بالوں کے درمیان بہت بھلے دکھائی دیتے ہیں، ممکن ہے بیگو کو یہی چاہ ہو کہ اُس کے بال سفید ہو جائیں اور وہ اپنی کم عمری کے باوجود بڈھی دکھائی دے

میں نے اُس کے خشک مگر نرم بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی اور کہا "تم کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتیں"

اُس نے سر اٹھا کر مجھ سے پوچھا "کیوں؟ ——— میں کیوں بوڑھی نہیں ہو سکتی؟"

"اس لئے کہ تم میں آس پاس کے درختوں، پہاڑوں اور اُن میں بہتے ہوئے نالوں کی ساری جوانی جذب ہو گئی ہے!

وہ قریب سے قریب سرک آئی اور کہنے لگی "جائیے آپ کیا اوٹ، پٹانگ باتیں کرتے ہیں۔ بھئی میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا ——— درختوں اور پہاڑوں کی بھی جوانی ہوتی ہے!"

"وہ تمہاری سمجھ میں آئے نہ آئے پر میں نے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے ——— پر آپ میرے بالوں میں اس اس طرح کرتے۔

رہیں" بیگو نے اپنے ہاتھ سے سر کو کھجلاتے ہوئے کہا" مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔"

"بہت اچھا جناب" کہہ کر میں نے انگلیوں سے اُس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کو تو مزا آ رہا ہی تھا، مجھے خود ہی مزا آنے لگا۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اُس کے بال میرے اُلجھے ہوئے خیال ہیں۔ جن کو میں اپنے ذہن کی اُنگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔

دیر تک میں اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ وہ خاموشی سے، سر جھکائے مزا لیتی رہی پھر اُس نے اپنی خمار آلود نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور نیند میں بھیگی ہوئی آواز میں کہا" میں اگر سو گئی تو؟"

"میں جاگتا رہوں گا"

نیم خوابیدہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پیدا ہوئی اور وہ زمین پر، وہیں میرے سامنے لیٹ گئی تھوڑی دیر کے بعد نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

بیگو سو رہی تھی مگر اُس کی جوانی جاگ رہی تھی۔ جس طرح سمندر کی پُرسکون سطح کے نیچے گرم لہریں دوڑتی رہتی ہیں۔ بائیں بازو کو سر کے نیچے رکھے اور ٹانگوں کو اکٹھا کیے وہ سو رہی تھی اُس کا ایک بازو میری جانب سرکا ہوا تھا میں اُس کی پتلی انگلیوں کی مخروطی تراش دیکھ رہا تھا کہ اُن میں خفیف سی کپکپاہٹ پیدا ہوئی جیسے مٹر کی پھلیاں ارتعاش پذیر ہو جائیں۔ یہ ارتعاش اُس کی انگلیوں سے شروع ہو کر اُس کے سارے جسم پر پھیل گیا۔ جس طرح تالاب میں پھینکی ہوئی کنکری اُس کی آبی سطح پر چھوٹا سا بھنور پیدا کرتی ہے اور یہ بھنور دائرے بناتا ہوا پھیلتا جاتا ہے، اُسی طرح وہ کپکپاہٹ اُس کی انگلیوں سے شروع ہو کر

اس کے سارے جسم پر پھیل گئی نہ جانے اُس کی جوانی کیسے ارتعاش پیدا کرنیوالے خواب دیکھ رہی تھی۔

اُس کے نچلے ہونٹ کے کونوں میں خفیف سی تھرتھراہٹ کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے سینے کے اُبھار میں دل کی دھڑکنیں زندگی پیدا کر رہی تھیں۔ گریبان کے نچلے دو بٹن کھلے تھے اس طرح جسم سے تھوڑی سی نقاب اُٹھ گئی تھی اور دو نہایت ہی پیاری قوسیں باہر جھانک رہی تھیں۔ سینے کی ننھی سی وادی میں دونوں طرف کے اُبھار بڑی خوبصورتی سے آپس میں گھُل مل گئے تھے۔

میری نگاہ اُس کے سینے پر کرتے کی ایک طرف بنی ہوئی جیب پر رک گئی اُس میں خدا معلوم کیا کیا کچھ بیگو نے ٹھونس رکھا تھا کہ وہ ایک گیند سی بن گئی تھی میرے دل میں دفعتہً یہ معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اُس میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ آہستہ سے اُس کی جیب کی تلاشی لینے کا ارادہ جب میں نے کیا تو وہ جاگ پڑی۔ سیدھی لیٹ کر اُس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں لمبی لمبی پلکیں جو آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ تھرتھرائیں۔ اُس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا، پھر اُس کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم نے انگڑائی لی اور کہا۔ آپ بڑے وہ ہیں؟"

"کیوں میں نے کیا کیا ہے؟"

وہ اُٹھ بیٹھی "ابھی آپ نے کچھ کیا ہی نہیں، میں سچ مچ سو گئی اور آپ نے جگانے تک کی تکلیف نہ کی۔ میں اگر ایسے ہی شام تک سوتی رہتی تو؟"

تو اُس نے آنکھوں کی پتلیاں نچائیں اور دفعتہً کچھ یاد کر کے کہا "ہائے میرے اللہ ـــ میں اپنی جان، ہیر کو بھول ہی گئی"

اُس نے پہاڑی پر اُگی ہوئی سبز جھاڑیوں کی طرف جب اُس نے دیکھا تو اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی "کتنی اچھی ہے میری ہیر"

اس کو اپنی بھینس کی فکر تھی، جو ہمارے سامنے پہاڑی پر گھاس چر رہی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا یہ تمہاری ہیر تو موجود ہے پر رانجھا کہاں ہے؟"

"رانجھا؟" اُس کے لب مُسکراہٹ کے ساتھ کھلے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی اور پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی "رانجھا — رانجھا — رانجھا" اُس نے یہ لفظ کئی مرتبہ دُہرایا۔ میری ہیر کا رانجھا۔ مجھے کیا معلوم نگوڑا کہاں ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری ہیر کا کوئی نہ کوئی رانجھا تو ضرور ہوگا۔ مجھ سے چھپانا چاہتی ہو یہ تو الگ بات ہے"

"اس میں چھپانے کی بات ہی کیا ہے" بیگو نے آنکھیں مٹکا کر کہا "اور اگر کوئی ہے تو ہیر کو معلوم ہوگا۔ چاہے اس سے پوچھ لیجئے۔ پر کان میں کہئے گا آہستہ سے کہیئگا۔ بتاؤ تمہارا رانجھا کہاں ہے؟"

"میں نے پوچھ لیا"

"کیا جواب ملا؟"

"وہ بولی بیگو سے پوچھو، وہی سب کچھ جانتی ہے"

"جھوٹ — جھوٹ۔ اس کا اول جھوٹ اس کا آخر جھوٹ" بیگو بچوں کی طرح اُچھل اُچھل کر کہنے لگی "میری ہیر تو بڑی شرمیلی ہے۔ ایسے سوالوں کا وہ کبھی جواب دے ہی نہیں سکتی۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اُس نے تو آپکو غصے میں کہا تھا، چلو ہٹو، کنواریوں سے ایسی باتیں کرتے تمہیں شرم تو نہیں آتی"

"یہی کہا تھا اور اُس کا جواب اِس کو یوں ملا تھا، یہ تمہارا اتنا بڑا بچھڑا کہاں سے آگیا ہے کیا آسمان سے ٹپک پڑا تھا"

بیگو یہ بچھڑے والی دلیل سنکر لاجواب ہو گئی، مگر وہ چونکہ لاجواب

ہونا نہیں چاہتی تھی اس لئے اُس نے بیکار چلانا شروع کر دیا۔" جی ہاں آسمان ہی سے ٹپکا تھا اور سب چیزیں آسمان ہی سے تو آتی ہیں..... نہیں، میں بھولی ـــ اس بچھڑے کو تو میری ہیر نے گود لیا ہے یہ اس کا بچہ نہیں کسی اور کا ہے ـــ اب بتایئے آپ کے پاس کیا جواب ہے؟"

میں نے ہار مان لی اس لئے کہ میری نگاہیں پھر اس کی اُبھری ہوئی جیب پر پڑیں۔ جس میں خدا معلوم کیا کیا کچھ ٹھنسا ہوا تھا۔ میں ہار گیا ـــ آپ کی ہیر کنواری ہے۔ دنیا کی سب بھینسیں اور گائیں کنواریاں۔ میں کنوارا ہوں آپ کنواری ہیں۔ لیکن یہ بتایئے کہ آپ کی اس کنواری جیب کو کیا ہو گیا ہے؟"

اُس نے اپنی پھولی ہوئی جیب دیکھی تو دانتوں میں انگلی دبا کر میری طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا "آپ کو شرم نہیں آتی..... کیا ہوا ہے میری جیب کو۔ میری چیزیں پڑی ہیں اِس میں۔"

"چیزیں ـــ اس سے تمہارا مطلب؟"

"آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ چیزیں پڑی ہیں میرے کام کی" اور کیا میں نے پتھر ڈال رکھے ہیں۔"

"تو جیب میں تمہارے کام کی چیزیں پڑی ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں یہ کام کی چیزیں کیا ہیں؟"

"آپ ہرگز نہیں پوچھ سکتے اگر آپ پوچھیں بھی تو میں نہیں بتاؤں گی اس واسطے کہ آپ نے مجھے اپنے چمڑے کے تھیلے کی چیزیں کب دکھائی ہیں، میں اگر آپ سے کہوں بھی تو آپ کبھی نہ دکھائیں گے۔"

"میں ایک ایک چیز دکھانے کے لئے تیار ہوں ـــ یہ رہا تھیلا۔"

میں نے اپنا چرمی تھیلا اُس کے سامنے رکھ دیا۔" خود کھول کر دیکھ لو پر یاد رہے مجھے اپنی جیب کی سب چیزیں تمہیں دکھانی پڑیں گی۔"

"پہلے میں اس تھیلے کی تلاشی تو لے لوں" یہ کہہ کر اُس نے میرا تھیلا کھولا اور اس کی سب چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنا شروع کیں۔ انگریزی کا ایک ناول، کاغذوں کا پیڈ، دو پنسلیں، ایک ربڑ، دس بارہ لفافے اور آٹھ آنے والے ٹکٹ جس پہ خالی لفافہ اور لکھے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ ــــ یہ میری "چیزیں" تھیں۔

جب وہ ایک ایک چیز اچھی طرح دیکھ چکی تو میں نے اُس سے کہا: "اب اپنی جیب کا منہ اِدھر کر دیجیے"۔

اُس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ تھیلے میں تمام چیزیں رکھنے کے بعد اُس نے مجھ سے تحکمانہ لہجہ میں کہا: "اب اپنی جیب دکھائیے"۔

میں نے اپنی جیب کا منہ کھول دیا۔ اور اُس نے ہاتھ ڈال کر اُس میں جو کچھ بھی تھا۔ باہر نکال لیا، ایک بٹوا اور چابیوں کا گچھا تھا، جس میں چھوٹا سا، چاقو بھی شامل تھا۔ یہ چاقو گچھے میں سے نکال کر اُس نے ایک طرف زمین پر رکھ دیا اور باقی چیزیں مجھے واپس دے دیں۔ "یہ چاقو میں نے لے لیا ہے۔ کھیرے کاٹنے کے کام آئے گا"۔

"لے لو پر مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو ــــ میں جب تک تمہاری جیب کی ایک ایک چیز نہ دیکھ لوں چھوڑوں گا نہیں"۔

"اگر میں نہ دکھاؤں تو؟"

"لڑائی ہو جائے گی"۔

"ہو جائے ــــ میں ڈر تھوڑی جاؤں گی" یہ کہہ کر فوراً ہی اپنے دوپٹے کا تنبو بنا کر اُس میں چھپ گئی اور جیب میں سے کچھ نکالنے لگی اس پر میں نے رعب دار آواز میں کہا: "دیکھو یہ بات ٹھیک نہیں، تم کچھ چھپا رہی ہو"۔

"آپ مان لیجیے۔ میں سب کچھ دکھا دوں گی ــــ اللہ کی قسم سب

چیزیں ایک ایک کر کے دکھا دوں گی —— یہ تو میں اپنے من سمجھوتے کے لئے کچھ کر رہی ہوں۔"

میں نے پھر رعب دار آواز میں کہا "یہ کیا کر رہی ہو۔ میں تمہاری سب چالاکیاں سمجھتا ہوں۔ سیدھے من سے تمام چیزیں دکھا دو ورنہ میں زبردستی سب کچھ دیکھ لوں گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوپٹے سے باہر نکل آئی اور آگے بڑھ کر، کہنے لگی "دیکھ لیجئے!"

میں اُس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے والا ہی تھا کہ اُس کے تنے ہوئے سینے کو دیکھ کر رُک گیا — "تم خود ہی ایک ایک چیز نکال کر مجھے دکھاتی جاؤ — تو اتنا لحاظ میں تمہارا کئے دیتا ہوں۔ یوں تمہاری ایمان داری بھی معلوم ہو جائے گی۔"

"نہیں آپ خود نکالتے جائیے، بعد میں آپ کہیں گے۔ میں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں۔"

"میں دیکھ جو رہا ہوں۔ تم نکالتی جاؤ۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" یہ کہہ کر اُس نے آہستہ سے اپنی جیب میں دو انگلیاں ڈالیں اور سرخ رنگ کے ریشمین کپڑے کا ایک ٹکڑا باہر نکالا۔ اس پر میں نے پوچھا "کپڑے کا یہ بیکار سا ٹکڑا تم ساتھ ساتھ کیوں لئے پھرتی ہو؟"

"جی آپکو کیا معلوم، یہ بہت بڑھیا کپڑا ہے میں اس کا رومال بناؤں گی جب بن جائیگا تو پھر آپ دیکھئے گا۔ جی ہاں۔" یہ کہہ کر اُس نے کپڑے کا ٹکڑا اپنی جھولی میں رکھ دیا۔ پھر جیب سے کچھ نکالا اور بند مٹھی میرے بہت قریب لا کر کھول دی۔ سلولائڈ کے تین مستعمل کلپ، ایک، چابی اور سیپ کے دو بٹن اُس کی ہتھیلی پر مجھے نظر آئے!

میں نے اُس سے کہا "اپنی جھولی میں رکھ لو اور باقی چیزیں جلدی، جلدی نکالو۔"

اُس نے جیب میں جلدی جلدی ہاتھ ڈال کر باری باری یہ چیزیں باہر نکالیں سفید دھاگے کی گولی اس میں پھنسی ہوئی زنگ آلود سوئی لکڑی کی میلی کچیلی کنگھی، چھوٹا سا ٹوٹا ہوا آئینہ اور ایک پیسہ!

میں نے اُس سے پوچھا "کوئی اور چیز باقی تو نہیں رہی؟"

"جی نہیں" اُس نے اپنے سر کو جنبش دی "سب چیزیں آپ کے سامنے رکھ دی ہیں۔ اب کوئی باقی نہیں رہی۔"

"غلط" میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا "تم جھوٹ بولتی ہو اور جھوٹ بھی ایسا بولتی ہو جو بالکل کچا ہو۔ ابھی ایک چیز باقی ہے" جوں ہی یہ لفظ میرے منہ سے نکلے، غیرارادی طور پر اُس کی نگاہیں یک لخت اپنے دوپٹے کی طرف مڑیں۔ میں نے تاڑ لیا کہ اُس نے کچھ چھپا رکھا ہے "بیگو سیدھے من سے مجھے یہ چیز دکھا دو جو تم نے چھپائی ہے، ورنہ یاد رکھو وہ تنگ کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گی۔ گدگدی، ایسی چیز ہے کہ......."

گدگدی کے تصوّر ہی نے اُس کے جسم کو، اکٹھا کر دیا۔ وہ سکڑ سی گئی۔ اس پر میں نے ہوا میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں نچائیں "یہ انگلیاں ایسی گدگدی کر سکتی ہیں کہ جناب کو پہروں بھی ہوش نہ آئے گا۔"

وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے "نہیں، نہیں— خدا کے لئے کہیں ایسا بھی نہ کر دیجئے گا— میں مر جاؤں گی۔"

جب میں سچ مچ اپنے ہاتھ اُسکے کندھوں تک لے گیا تو وہ بے تحاشا

چیختی ہانپتی اور سمٹتی سمٹاتی اُٹھی اور بھاگ گئی — دوپٹے میں سے کوئی چیز گری جو میں نے دوڑ کر اٹھالی — مصری کی ایک ڈلی تھی جو وہ مجھ سے چھپا رہی تھی — جانے کیوں؟

ماتمی جلسہ

رات رات میں یہ خبر شہر کے اُس کونے تک پھیل گئی کہ اتاترک کمال مرگیا ہے۔ ریڈیو کی تھرتھراتی ہوئی زبان سے یہ سنسنی پھیلانے والی خبر ایرانی ہوٹلوں میں سٹے بازوں نے سنی جو چائے کی پیالیاں سامنے رکھے آنے والے نمبر کے بارے میں قیاس دوڑا رہے تھے اور وہ سب کچھ بھول کر کمال اتاترک کی بڑائی میں گم ہوگئے۔

ہوٹل میں سفید پتھر والے میز کے پاس بیٹھے ہوئے ایک سٹوری نے اپنے ساتھی سے یہ خبر سُن کر لرزاں آواز میں کہا "مصطفٰے کمال مرگیا!"

اُس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی "کیا کہا مصطفٰے کمال مرگیا!"

اس کے بعد دونوں میں اتاترک کمال کے متعلق بات چیت شروع ہوگئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے، اب ہندوستان کا کیا ہوگا؟ میں نے سنا تھا یہ مصطفٰے کمال یہاں حملہ کرنیوالا ہے ...... ہم آزاد ہو جاتے، مسلمان قوم آگے بڑھ جاتی ..... افسوس تقدیر کے ساتھ کسی کی پیش نہیں چلتی!"

دوسرے نے جب یہ بات سنی تو اُس کے رونگٹے بدن پر چیونٹیوں کے

مانند سرکنے لگے۔ اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے دل میں جو پہلا خیال آیا، یہ تھا "مجھے کل جمعہ سے نماز شروع، کر دینی چاہیے......"

اس خیال کو بعد میں اُس نے مصطفیٰ کمال پاشا کی شاندار مسلمانی اور بڑائی میں تحلیل کر دیا۔

بازار کی ایک تنگ گلی میں دو تین کوکین فروش کھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے پان کی پیک بڑی صفائی سے بجلی کے کھمبے پر پھینکی اور کہا "میں مانتا ہوں، مصطفیٰ کمال بہت بڑا آدمی تھا لیکن محمد علی بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بمبئی میں تین چار ہوٹلوں کا نام اسی پر رکھا گیا ہے!"

دوسرے نے جو اپنی ننگی پنڈلیوں پر سے ایک کھردرے چاقو سے میل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا: "محمد علی کی موت پر تو بڑی شاندار ہڑتال ہوئی تھی......"

"ہاں بھئی تو کل ہڑتال ہو رہی ہے کیا؟ تیسرے نے ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دیا۔ اُس نے جواب دیا کیوں نہ ہو گی...... ارے اتنا بڑا مسلمان مر جائے اور ہڑتال نہ ہو۔"

یہ بات ایک راہ گیر نے سُن لی، اُس نے دوسرے چوک میں اپنے دوستوں سے کہی اور ایک گھنٹے میں ان سب لوگوں کو جو دن کو سونے اور رات کو بازاروں میں جاگتے رہنے کے عادی ہیں، معلوم ہو گیا کہ صبح ہڑتال ہو رہی ہے۔

ابو قصائی رات کو دو بجے اپنی کھولی میں آیا۔ اس نے آتے ہی، طاق پر سے بہت سی چیزوں کو اِدھر اُدھر پلٹ کرنے کے بعد ایک پڑیا نکالی اور ایک دیگچی میں پانی بھر کر اُس کو اُس میں ڈال کر گھولنا شروع کر دیا۔"

اس کی بیوی جو دن بھر کی تھکی ماندی ایک کونے میں ٹاٹ پر سو رہی تھی برتن کی رگڑ سُن کر جاگ پڑی۔ اُس نے لیٹے لیٹے کہا: "آ گئے ہو؟"

"ہاں آ گیا ہوں۔" یہ کہہ کر ایو نے اپنی قمیص اُتار کر دیگچی میں ڈال دی اور اُسے پانی کے اندر مسلنا شروع کر دیا۔

اُس کی بیوی نے پوچھا "تم یہ کیا کر رہے ہو!" "مصطفیٰ کمال مر گیا ہے۔ کل ہڑتال ہو رہی ہے!" اُس کی بیوی یہ سُن کر گھبراہٹ کے مارے اُٹھ کھڑی ہوئی "کیا مارا ماری ہو گی؟......میں تو ان ہر روز کے فسادوں سے بڑی تنگ آ گئی ہوں" وہ سر پکڑ کر رہ گئی "میں نے تجھ سے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ تو ہندوؤں کے اس محلے سے اپنا مکان بدل ڈال پر نہ جانے تو کب سُنے گا!"

ایو جواب میں ہنسنے لگا "ارے پگلی......یہ ہندو مسلمان کا فساد نہیں ہے۔ مصطفیٰ کمال مر گیا ہے......وہی جو بہت بڑا آدمی تھا کل اُس کے سوگ میں ہڑتال ہو گی!"

"جانے میری بلا یہ بڑا آدمی کون ہے......پر یہ تو کیا کر رہا ہے؟" بیوی نے پوچھا "سوتا کیوں نہیں ہے!" "قمیص کو کالا رنگ دے رہا ہوں......صبح ہمیں ہڑتال کرانے جانا ہے!" قمیص یہ کہہ کر اس نے قمیص نچوڑ کر دو کیلوں کے ساتھ لٹکا دی جو دیوار میں گڑی ہوئی تھیں۔"

دوسرے روز صبح کو سیاہ پوش مسلمانوں کی ٹولیاں کالے جھنڈے لئے بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں۔ یہ سیاہ پوش مسلمان دوکانداروں کی دوکانیں بند کرا رہے تھے اور یہ نعرے لگا رہے تھے: "انقلاب زندہ باد" "انقلاب زندہ باد!"

ایک ہندو کے جو اپنی دکان کھولنے کے لئے جا رہا تھا یہ نعرے سنے

اور نعرے لگانے والوں کو دیکھا تو چپ چاپ ٹرام میں بیٹھ کر وہاں سے کھسک گیا۔ دوسرے ہندو اور پارسی دوکان داروں نے جب مسلمانوں کے ایک گروہ کو چیختے چلّاتے اور نعرے مارتے دیکھا تو انھوں نے جھٹ پٹ اپنی دوکانیں بند کرلیں۔

دس پندرہ سیاہ پوش گپیں ہانکتے ایک بازار سے گذر رہے تھے۔ ایک نے اپنے ساتھی سے کہا "دوست ہڑتال ہوئی تو خوب ہے پر ویسی نہیں ہوئی جیسی محمد علی کے ٹیم پر ہوئی تھی..... ٹرامیں تو اسی طرح چل رہی ہیں"

اس ٹولی میں جو سب سے زیادہ جوشیلا تھا اور جس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا تنک کر بولا "آج بھی نہیں چلیں گی!" یہ کہکر وہ اُس ٹرام کی طرف بڑھا جو لکڑی کے ایک شیڈ کے نیچے مسافروں کو اُتار رہی تھی۔ ٹولی کے باقی آدمیوں نے اِس کا ساتھ دیا اور ایک لمحہ کے اندر سب کے سب ٹرام کی سُرخ گاڑی کے اردگرد تھے۔ سب مسافر زبردستی اُتار دیئے گئے۔

شام کو ایک وسیع میدان میں "ماتمی جلسہ ہوا"۔ شہر کے سب ہنگامہ پسند جمع تھے خوانچہ فروش اور پان بیڑی والے چل پھر کر اپنا سودا بیچ رہے تھے جلسہ گاہ کے باہر عارضی دوکانوں کے پاس ایک میلہ لگا ہوا تھا، چاٹ کے چنوں اور اُبلے ہوئے آلوؤں کی خوب بکری ہو رہی تھی۔

جلسہ گاہ کے اندر اور باہر بہت بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا، اس ہجوم میں کئی آدمی ایسے بھی چل پھر رہے تھے۔ جو یہ معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ اتنے آدمی کیوں جمع ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب گلے میں دوربین لٹکائے اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہے تھے دُور سے اتنی بھیڑ دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ پہلوانوں کا دنگل ہو رہا ہے۔ وہ ابھی ابھی اپنے گھر سے نئی دُوربین

لے کر دوڑے دوڑے آرہے تھے اور اس کا امتحان لینے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے، میدان کے آہنی جنگلے کے پاس دو آدمی کھڑے آپس میں بات چیت کر رہے تھے اور ایک نے اپنے ساتھی سے کہا "بھئی یہ مصطفےٰ کمال تو واقعی کوئی بہت بڑا آدمی تھا.......... میں جو صابن بنانے والا ہوں اُس کا نام "کمال سوپ" رکھوں گا.......... کیوں کیسا رہے گا؟"

دوسرے نے جواب دیا "وہ بھی بُرا نہیں تھا۔ جو تم نے پہلے سوچا تھا "جناح سوپ"..... یہ جناح مسلم لیگ کا بہت بڑا لیڈر ہے!"

"نہیں نہیں کمال سوپ اچھا رہے گا.......... بھائی مصطفےٰ کمال اس سے بڑا آدمی ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا دیا "آؤ چلیں جلسہ شروع ہونے والا ہے" وہ دونوں جلسہ گاہ کی طرف چل دیئے جلسہ شروع ہوا۔

آغاز میں نظمیں گائی گئیں جن میں مصطفےٰ کمال کی بڑائی کا ذکر تھا، پھر ایک صاحب تقریر کرنے کے لئے اٹھے۔ آپ نے کمال اتاترک کی عظمت بڑے بلند بانگ لفظوں میں بیان کرنا شروع کی۔ حاضرین جلسہ اس تقریر کو خاموشی سے سنتے رہے۔ جب کبھی مقرر کے یہ الفاظ گونجے "مصطفےٰ کمال نے درۂ دانیال سے انگریزوں کو لات مار کے باہر نکال دیا" یا کمال نے یونانی بھیڑیوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا" تو اسلام زندہ باد" کے نعروں سے میدان کانپ کانپ اُٹھتا۔

یہ نعرے مقرر کی قوتِ گویائی کو اور تیز کر دیتے۔ اور وہ زیادہ جوش سے اتاتورک کمال کی عظیم الشان شخصیت پر روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔

مقرر کا ایک ایک لفظ حاضرین جلسہ کے دلوں میں ایک جوش و خروش

پیدا کر رہا تھا۔

"جب تک تاریخ میں گیلی پولی کا واقعہ موجود ہے۔ برطانیہ کی گردن ترکی کے سامنے قلم رہے گی۔ صرف ترکی ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے برطانوی حکومت کا کامیاب مقابلہ کیا اور صرف مصطفٰے کمال ہی ایسا مسلمان ہے جس نے غازی صلاح الدین ایوبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی۔ اُس نے بہ نوکِ شمشیر یورپی ممالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ ترکی کو یورپ کا مردِ بیمار کہا جاتا تھا۔ مگر کمال نے اُسے صحت اور قوت بخش کر مردِ آہن بنا دیا۔"

جب یہ الفاظ جلسہ گاہ میں بلند ہوئے تو "انقلاب زندہ باد" "انقلاب زندہ باد" کے نعرے پانچ منٹ تک متواتر بلند ہوتے رہے۔

اس سے مقرر کا جوش بہت بڑھ گیا۔ اُس نے اپنی آواز کو اور بلند کر کے کہنا شروع کیا "کمال کی عظمت مختصر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنے ملک کے لیے وہ وہ خدمات سرانجام دی ہیں جن کو بیان کرنے کے لیے کافی وقت چاہیے۔ اس نے ترکی میں جہالت کا دیوالہ نکال دیا تعلیم عام کر دی تھی۔ نئی روشنی کی شعاعوں کو پھیلایا۔ یہ سب کچھ اُس نے تلوار کے زور سے کیا۔ اُس نے دین کو جب علم سے علیحدہ کیا تو بہت سے قدامت پسندوں نے اُس کی مخالفت کی مگر وہ سرِ بازار پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ اُس نے جب یہ فرمان جاری کیا کہ کوئی ترک رومی ٹوپی نہ پہنے تو بہت سے جاہل لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا چاہی مگر یہ آواز اُن کے گلے ہی میں دبا دی گئی۔ اُس نے جب یہ حکم دیا کہ اذان ترکی زبان میں ہو تو بہت سے ملاؤں نے عدول حکمی کی مگر وہ قتل کر دیئے گئے....."

"یہ کفر بکتا ہے" جلسہ گاہ میں ایک شخص کی آواز بلند ہوئی اور فوراً ہی سب لوگ مضطرب ہو گئے۔

"یہ کافر ہے جھوٹ بولتا ہے" کے نعروں میں مقرر کی آواز گم ہو گئی پیشتر اس کے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتا اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا اور وہ چکرا کر اسٹیج پر گر پڑا۔ جلسہ میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔

اسٹیج پر مقرر کا ایک دوست اُس کے ماتھے پر سے خون پونچھ رہا تھا اور جلسہ گاہ ان نعروں سے گونج رہی تھی "مصطفےٰ کمال زندہ باد" "مصطفےٰ کمال زندہ باد"

تلوّن

بارش کا شور — آہستہ آہستہ یہ شور شدت پکڑتا ہے۔

نیلم - (ڈرتے ہوئے لہجہ میں، کھڑکی بند کردو جمیل — باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے. گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے — اُف یہ کالی رات کیسی بھیانک ہے۔

جمیل - (ہنستا ہے) ان کالی رسیوں سے جو سانپ کی طرح بل تو کھاتی ہیں. مگر ڈس نہیں سکتیں (ہنستا ہے تمہارے سر کے یہ کالے دھاگے صرف شاعروں ہی کے لیے جال بن سکتے ہیں. نیلم..... ہاں تو کھڑکی کیا سچ مچ بند کردوں — کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے۔

نیلم - اس بھیانک رات سے زیادہ اسوقت مجھے تم سے خوف محسوس ہوتا ہے (کھڑکی بند کردیتی ہے۔)

جمیل - (جلدی سے، اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری کالی زلفیں ہیں۔

نیلم - تو ڈرنا چاہیئے - آپ کو۔

جمیل - خوف - مجھ سے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے — ہونا چاہیئے اس لیے کہ خوف ہی تم جیسی عورتوں کو آرام کرسکتا ہے — وہ شاعر — وہ شاعر — کیا نام تھا اُس شاعر کا؟

نیلم ۔ اب تم اپنے دوست کو اتنی جلدی بھول گئے۔

جمیل ۔ میں اُسے اُس کی موت کے بعد بھولا ہوں ، اس لیئے کہ اب اُس کو یاد رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا ——— اور تم اُسے تو اس کی زندگی ہی " میں بھول گئی تھیں ،

نیلم ۔ خدا کے لیئے ——— گڑے مُردے نہ اُکھاڑو جمیل !

جمیل ۔ جو تم کفنائے بغیر دفن کر چکی ہو ——— نیلم واللہ اگر میں کبھی تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں تو مزا آجائے ——— تمہیں اپنی اس انگوٹھی میں نگینے کی طرح نہ جڑ لوں تو میرا نام جمیل نہیں ——— وہ لوگ ، بیوقوف تھے جو تمہارے عشق میں آہیں بھرتے مر گئے ——— مجھے تعجب ہے کہ اُن میں سے کسی نے تمہارا گلا کیوں نہیں کاٹ ڈالا ۔ یہ سفید سفید گلا ۔ جس میں سے تم اتنے اچھے سُر نکال سکتی ہو اور اپنے راگ کا جادو چلاتی ہو ۔

نیلم ۔ تم کیوں نہیں کاٹ ڈالتے ۔

جمیل ۔ اس لیئے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا ۔

نیلم ۔ مانتی ہوں ، لیکن پھر تم مجھ سے دلچسپی کیوں لیتے ہو ؟

جمیل ۔ سیاح جب بمبئی آتے ہیں تو مالا بار کی پہاڑی پر وہ مقام دیکھنے لیئے ضرور ٹھہر جاتے جہاں باؤلا قتل کیا گیا تھا ——— میں تم سے ملتا ہوں اس لیئے کہ تم ایک ایسا تاریخی مقام بن گئی ہو جہاں کئی بیوقوفوں نے جان دی ہے ۔

نیلم ۔ تم چاہو تو شاعر بن سکتے ہو ۔

جمیل ۔ مگر تم چاہو تو کچھ بھی نہیں بن سکتیں ——— عورت ازل سے ایک ہی راگ لے کر آئی ہے جسے وہ وقت بے وقت گاتی رہتی ہے ———

بتاؤ تمہارے سازِ حیات میں دھوکے اور فریب کے سوا کیا اور کوئی راگ ہے۔

نیلم ۔ بہت سے راگ ہیں۔ جب تم مجھ سے محبت کرو گے تو سناؤ گی۔ فی الحال یہ چند شعر سنو۔

جمیل ۔ کیا اس بے وقوف شاعر کے ہیں۔

نیلم ۔ نہیں میرے اپنے ہیں؟

(باجے پر انگلیاں چلاتی ہے اور ذیل کے شعر گاتی ہے)

(زندگی ایک سرگرانی ہے ٭ یہ مرا عالم جوانی ہے
یہ جو پلکوں پہ قطرہ خوں ہے ٭ تیرے اکرام کی نشانی ہے
مسکرانا جسے نصیب نہ ہو ٭ وہ جوانی بھی کیا جوانی ہے)

(احمد ندیم قاسمی)

جمیل ۔ اچھا گاتی ہو ——— (گلاس میں شراب انڈیلتا ہے۔) ——— اور یہ شراب بھی بری نہیں۔

نیلم — (آخری شعر گاتی ہے) ...... ؎

ہے ان آنکھوں کا رنگ پانی میں ٭ ورنہ کیا ہے شراب پانی ہے

جمیل ۔ خود ستائی کا دوسرا نام عورت ہے، کیوں نیلم ——— ؟ اور معلوم ہوتا ہے آج کسی نے تمہاری آنکھوں کی تعریف نہیں کی، جب ہی تمہیں ان کا رنگ شراب میں گھولنا پڑا ——— بخدا نیلم تم بڑی دل چسپ عورت ہو۔ تمہاری پلکوں پھنسے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے ریگستان کے کنوئیں یاد آ جاتے ہیں۔ ہاں یہ تو بتاؤ آج تم رو کیوں رہی ہو ——— اگر مجھے مرعوب کرنے کے لئے تم نے یہ آنسو بہائے ہیں تو میں کہوں گا کہ تم نے ناحق تکلیف کی۔ میرے دل کی چھت ٹپکتی نہیں۔

نیلم ۔ دباجے کے پردے چھیڑتی ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہے
جمیل عورتیں روتی ہیں بیوقوف ـــــ جانتے ہو عورتیں کیوں
روتی ہیں؟

جمیل ۔ کہ مرد زیادہ شراب پئیں ۔ (اور گلاس میں شراب ڈالتا ہے)
نیلم ۔ (تنگ آکر ۔ بلند آواز میں) ـــ جمیل ـــ ایک دم آواز دباکر)
اب میں تم سے کیا کہوں جمیل؟

جمیل ۔ کہو کہ جمیل تم خوبصورت ہو ـــ تمہاری گفتگو ایسی ہے جیسے شراب
کے یہ متحرک بلبلے ـــ تمہاری جوانی ایسی ہے جیسے اس ساز کے
تنے ہوئے تار ـــ تم عورتوں کا ـــ تم حسین عورتوں
کا ـــ کہو کیا کہو گی ـــ ہاں کہو کہ تم حسین عورتوں کا خواب
جمیل ہو ـــ کہو کچھ ایسا ہی کہو اور کہہ کے چلی جاؤ ـــ اگر عورتیں
اپنی تعریف سے خوش ہو سکتی ہیں تو کیا ایک مرد نہیں ہو سکتا۔
ہاں یہ تو بتاؤ نیلم، آج تمہاری شراب سسکیاں کیوں بھر رہی ہے
ـــ میں نے دو گھونٹ پیئے ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے
کہ میرے حلق سے دو آہیں نیچے اتر گئی ہیں ـــ یہ شراب کسی دل
جلے کا تحفہ تو نہیں؟

(کھڑکی ہوا کے دباؤ سے کھل جاتی ہے باہر بارش کا شور سنائی دیتا ہے)

جمیل ۔ کھڑکی بند کر دو ۔ نیلم ۔ باہر رات کا اندھیرا ایسا معلوم ہوتا ہے ۔
گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے ـــ آف یہ کالی
رات، کتنی بھیانک ہے ۔

نیلم ۔ اتنی بھیانک نہیں جتنی تمہاری گفتگو ہے ۔

جمیل ۔ تو مجھ سے ڈرنا چاہیے تمہیں ۔

نیلم ۔ ہنستی ہے، ڈرنا چاہیے ـــ تمہاری ان باتوں سے جو بالکل

کھو گئی ہیں (ہنستی ہے) ان چنگاریوں سے جن میں خود بھی جلنے کی قوت نہیں۔ ہاں تو کھڑکی کیا۔ سچ مچ بند کر دوں۔ کیا تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے؟

(کھڑکی بند کر دیتی ہے)

جمیل۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام مردوں کی روحیں، جو، تمہاری محبت کا زہر پی کر اس دنیا سے اُٹھ گئے ہیں، آج رات اس کالی بارش میں نہا رہی ہیں — نیلم ذرا خیال کرو، اگر سچ مچ یہ روحیں تمہارا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں تو — تو .....

نیلم۔ اگر تمہاری روح بھی اس قطار میں ہوئی تو شاید مجھے ایک لمحے کے لئے ٹھٹکنا پڑے۔

جمیل۔ کیوں؟

نیلم۔ اس کیوں کا جواب اُس وقت دوں گی جب تمہاری رُوح کالی بارش میں نہائے گی اور میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے گی .....

جمیل۔ تم اب دلیر ہو گئی ہو۔

نیلم۔ تم اسے دلیری کہتے ہو مگر یہ عورت کی سب سے بڑی بزدلی ہے۔

جمیل۔ کیا؟

نیلم۔ یہی ..... یہی دلیری!

جمیل۔ تمہاری باتیں اس وقت شراب کے گھونٹوں سے زیادہ مزے دے رہی ہیں۔

نیلم۔ تو شراب چھوڑ دو۔ یہی پیو

جمیل۔ بخدا آج تم نے میری طبیعت خوش کر دی۔ میں تم سے وعدہ کرتا

ہوں۔ جب میرے ہوش و حواس بجا نہ رہے تو چند دنوں کے لیۓ تم سے ضرور محبت کروں گا —— جانتی ہو محبت کسے کہتے ہیں ؟

نیلم ۔ ہوش و حواس بجا نہ رہنے کی صورت میں کسی عورت سے چند دنوں کے لیۓ کھیلنا

جمیل ۔ تمہاری یہ باتیں کسی روز مجھے مجبور کر دیں گی کہ میں —— کہ میں ......

نیلم ۔ کہو —— کہو

جمیل ۔ کہ میں تمہیں ایک کتاب بنا کر اپنی الماری میں رکھ لوں۔ تم سی عورتوں کو فرصت کے وقت ضرور پڑھنا چاہیۓ۔

نیلم ۔ پہلے قاعدہ تو پڑھ لیا ہوتا۔

جمیل ۔ ہوشیار طالب علموں کے لیۓ ابتدائی معلومات اتنی ضروری نہیں ہوتیں۔

نیلم ۔ ہاۓ تمہاری ہوشیاری —— تمہیں اِس ہوشیاری پر کتنا ناز ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ہوشیاری کسی عورت کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔

جمیل ۔ میری ہوشمندی شاعروں کی ہوشمندی نہیں —— ہاں یہ تو بتاؤ۔ تم نے اس بیچارے شاعر سے اتنا برا سلوک کیا ؟

نیلم ۔ اس لیۓ کہ مجھ سے تمہارا سلوک اچھا نہیں تھا۔

جمیل ۔ یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔

نیلم ۔ اور نہ کبھی آۓ گی —— اپنے گھروں میں آسانی کے ساتھ سوٹ کیسوں کا تالا کھولنے والے مرد جب کسی عورت کے دل کا تالا کھولنا چاہیں تو یہی مشکل پیش آیا کرتی ہے۔ اور وہ لوگ جو تم ایسے مشکل

پسند ہوتے ہیں۔ آسانیاں اُن کے لیئے دُشواریاں، ہوتی ہیں۔

جمیل۔ کون سی آسان بات سمجھنا میرے لیئے دشوار ہے۔

نیلم۔ کہ تمہارے بُرے سلوک نے مجھے تمہارے شاعر دوست سے بُرا سلوک کرنے پر مجبور کر دیا۔

جمیل۔ کتنی آزادو نہ مجبوری ہے۔

نیلم۔ تمہیں سیدھی سادھی بات میں الجھاؤ پیدا کر کے شاید لطف آتا ہے لیکن یاد رکھو کسی روز تم خود ان بھول بھلیوں میں ایسے پھنسو گے کہ نکلنے کا نام نہ لو گے ـــــ حقائق کا ہر وقت منہ چڑانا بھی اچھا نہیں۔ تم جانتے ہو ـــــ تم محسوس کرتے ہو اس لیئے کہ محسوس کرنا جاننے سے بہتر ہے۔ بہتر ہے کہ تمہارے دوست شاعر کی محبت کو میں نے صرف اس لیئے ٹھکرا دیا کہ تمہاری ٹھوکروں سے مجھے پیار ہو گیا تھا۔

جمیل۔ میں زیادہ شراب تو نہیں پی گیا؟

نیلم۔ نہیں تم نے صرف دو گلاس پیئے ہیں۔ مدہوش میں ہو رہی ہوں

جمیل۔ تو پھر کوئی حرج نہیں ـــــ کہو کیا کہہ رہی تھیں۔ تم نے میرے شاعر دوست کی محبّت کو صرف اس لیئے ٹھکرا دیا کہ میری ٹھوکروں سے تمہیں پیار ہو گیا تھا ـــــ ہاں پھر کیا ہوا؟

نیلم۔ جو نا ہونا تھا۔

جمیل۔ یعنی۔

نیلم۔ شاعروں کے سینکڑوں شعر میں ہر روز پھانکتی رہی مگر میرے دل میں محبت کی شعریت پیدا نہ ہوئی اور تمہاری خشک باتوں نے...

دکھڑ کی شور کے ساتھ کھلتی ہے۔ ہوا کی تیز سیٹیاں کمرے میں پھیل جاتی

ہیں": عباس کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوتا ہے۔ نیلم چیختی ہے)
...... عباس۔

عباس۔ (زور سے کھڑکی بند کر دیتا ہے اور فرش پر اپنے وزنی بوٹوں سے چلتا نیلم کے پاس آجاتا ہے) —— ہاں شاعر عباس۔ مگر یہ چیخ کیسی —— کیا پرانے دوستوں کا استقبال ایسی چیخوں سے کیا جاتا ہے؟ اور جمیل تم کیوں ڈر گئے —— کیا میں تمہارا عزیز دوست عباس نہیں ہوں، جس کے سینکڑوں شعر ہر روز پھانکنے پر بھی نیلم کے دل کا ہاضمہ درست نہیں ہوا —— خبردار جو تم اپنی جگہ سے ہلے —— میرا پستول شعر نہیں کہتا۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے بدکلامی ہو جائے —— ہاں کہو نیلم تم کیا کہہ رہی تھیں —— [illegible] باتوں نے جمیل کی خشک باتوں نے کیا کیا؟

نیلم۔ ([illegible] لہجہ میں) ...... عباس تم زندہ ہو!

عباس۔ مجھے خود تو یہی محسوس ہوتا ہے۔

جمیل۔ ریل گاڑی کے حادثہ میں تمہارے مرجانے کی افواہ ....

عباس۔ غلط تھی۔ لیکن آج شب کے حادثے میں تمہارے مرجانے کی افواہ غلط نہ ہوگی۔

جمیل۔ تو مجھے ابھی ابھی وصیت کر دینا چاہیئے اور اپنی ساری جائداد تمہارے حق میں محفوظ کر دینا چاہیئے۔

عباس۔ تمہاری جائداد —— کیا ہے تمہاری جائداد؟

جمیل۔ میری خشک باتیں جو تمہارے شعروں کے ساتھ مل کر نیلم کا دل موہ سکیں۔

عباس۔ (ایکدم غصے میں آکر) ...... جو میں نہ موہ سکا یہی چاہتے ہو نا تم —— دبی زبان میں آج تم نے جس بات کی طرف اشارہ کیا،

ہے اگر مجھے پہلے معلوم ہوتی تو میرے دل کا بوجھ اس قدر زیادہ نہ ہوتا — وہ بوجھ جو اب تمہیں اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑے گا — میں بیوقوف ہوں — جیسا کہ تم نیلم سے کہہ رہے تھے شاعر بیوقوف ہی ہوا کرتے ہیں مگر وہ تم جیسے غدار نہیں ہو سکتے۔ بھیڑ کی کھال میں تم جیسے چیتے نہیں ہو سکتے۔ تم — تم، اپنی طرف سے شاید ایک دلچسپ کھیل کھیلتے رہے مگر جانتے ہو تم نے مجھے یہ دکھ پہونچایا ہے — تم نے میری حساس روح کو پاؤں تلے روند دیا ہے — تم نے شاعر کو تکلیف نہیں دی ایک انسان کو دکھ دیا ہے جو محبت میں گرفتار تھا۔ جانتے ہو محبت کرنے والے انسانوں کی روح بہت حساس ہوتی ہے؟

جمیل۔ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

عباس۔ لیکن اب تمہیں کرنا ہو گی۔

جمیل۔ کس سے۔

عباس۔ نیلم سے — اس عورت سے جس سے میں محبت کرتا ہوں اس مغنیہ سے جس کے حلق سے نکلے ہوئے سُروں میں اتنے برس میری روح آشیانہ بناتی رہی اور جس کے تنکے تم نے ہوائی بگولا بن کر اڑا دیئے — سنتے ہو! اُس عورت سے۔ جس کی نوازشات میری نرم و نازک شاعری نے بنائی ہے تم اپنی کمزوری باتوں سمیت محبت کرو گے۔

جمیل۔ اور تم؟

عباس۔ میں — میں تمہارا تماشا دیکھوں گا۔

جمیل - تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ میں واقعی نیلم سے محبت کرتا ہوں۔

عباس - تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہوگا - اور اس سے میری محبت کا ثبوت یہ ہے کہ آج نصف شب کے بعد شاعر عباس، نیلم پر اپنی جان قربان کر دے گا ——— اُس دُنیا میں چلا جائے گا جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔

جمیل - دوسرے لفظوں میں مجھے اُس دُنیا میں جانا پڑے گا جہاں شعریت ہی شعریت ہے

عباس - تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو۔

نیلم - عباس - خدا کے لئے عباس ایسے بے رحم نہ بنو۔

عباس - اس سے تمہاری محبت کا ثبوت لینا کوئی بے رحمی نہیں ——— میں بھی تو اس بات کا ثبوت دوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

نیلم - کیسے؟

عباس - اس گلاس میں جس میں جمیل شراب پیتا رہا ہے - میں زہر گھول رہا ہوں (گلاس کی آواز) ——— پہلا گھونٹ جمیل پیئے گا، جب زہر اُس کو ہلاک کر دے گا تو دوسرا گھونٹ میں پیوں گا۔

نیلم - یہ کیسے ہو سکتا ہے عباس ——— تمہارا دماغ بہک گیا ہے۔

جمیل - اور اگر میں انکار کر دوں؟

عباس - تو میرا پستول کبھی انکار کرے گا۔

جمیل - پستول کی گولی سے مرنا شاندار نہیں ——— میں زہر ہی پیوں گا، مگر مجھے اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ میری موت کے بعد، تمہاری موت بھی ہوگی ——— کیا نیلم مجھے اس بات کا یقین دلا سکتی ہے۔

نیلم - میں ——— لیکن عباس شاعر ہے۔

جمیل۔ تو ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلے عباس زہر پیئے اور اُس دُنیا کا دروازہ۔ کھٹکھٹائے جہاں شعریت ہی شعریت ہے۔ میں اُس کے پیچھے آنے کا وعدہ کرتا ہوں ـــــ اس تھوڑے وقفے میں مجھے نیلم کی محبت میں گرفتار ہونے کا موقع بھی مل جائے گا۔

نیلم۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ سارا زہر میں ہی اپنے حلق سے نیچے اتار لوں ـــ اور پھر ایک دوسرے کے دوست بن جاؤ ـــــ ایک دوسرے سے محبت کرنا شروع کردو۔

عباس۔ (بلند آواز میں) نہیں ـــــ ہرگز نہیں ـــــ موت کا یہ جال میری مرضی کے مطابق پانی میں ڈالا جائے گا ـــــ پہلے جمیل تم اس جال میں آؤ گے پھر میں ـــــ اور نیلم زندہ رہے گی ـــ اس کو زندہ رہنا پڑے گا ـــــ جب زہر تمہارے اندر سرایت کر جائے گا اور موت کا مضبوط ہاتھ تمہیں رسی کے مانند بٹ دے گا تو نیلم کے دل پر تڑتڑ ے پڑیں گے۔ اس نیلم کے دل پر جس نے شاعر عباس کے دل کو فضول سمجھ کر توڑ دیا ـــ تم مرو گے اور میں جیوں گا۔ میں جیوں گا اور تم مرو گے (دیوانہ وار ہنستا ہے) ـــ ہاں ہاں تمہیں مرنا ہو گا ـــــ میں خود مروں گا مگر زندہ ہو کر اور تم مرو گے ادھ موئے ہو کر (ہنستا ہے) برف کے ٹکڑوں سے۔ اپنی تابانی ادھار لینے والی نیلم کے لئے آج کڑی آزمائش کا دن ہے ـــــ اس کی آنکھوں کے سامنے آج اس کے دو چاہنے والے موت کی گہرائیوں میں اُتریں گے۔

جمیل۔ مذاق ختم ہو چکا ـــ رات بہت گذر چکی ہے عباس میں سمجھتا ہوں کہ اب تماشے کو بند کر دینا چاہیئے۔ نیلم برف کی سلوں سے اپنی تابانی اُدھار لیتی ہے، تم ان سے تھوڑی سی سردی مانگ لو، اور،

خدا کے لئے اس آگ کو بجھائیے ــــ میں آگ تاپنے ، کا ۔
عادی نہیں ہوں ۔

عباس ۔ (زور سے قہقہہ لگاتا ہے ، صرف باتیں ہی بنانے کے عادی ہو ــــ تم آگ لگا سکتے ہو مگر آگ لگا کر اس کا تماشہ دیکھنے کی تاب تم میں نہیں ــــ نیلم تمہاری ٹھوس چٹان چٹخنا شروع ہو گئی ۔ بس اب کچھ دم میں ریزہ ریزہ ہوا چاہتی ہے ــــ (ہنستا ہے) ــــ تمہیں عورتوں سے کھیلنا پسند ہے ۔ مگر زہر کا ایک گھونٹ تم سے نہیں پیا جاتا ــــ میرے دوست ! عورتیں زہر سے زیادہ زہریلی ہوتی ہیں ۔

جمیل ۔ ہوں گی مگر اُن کے لئے جو اُن سے دلچسپی لیتے ہیں ۔

نیلم ــــ عباس ــــ جمیل ٹھیک کہتا ہے ــــ اسے مجھ سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ میں اس کی دل چسپ باتوں میں دلچسپی لوں ۔

عباس ۔ کیا دلچسپ بات ہے ــــ اور زہر کے یہ گھونٹ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ــــ کتنے پیو گے میرے لئے تو ایک ہی کافی ہو گا ۔

جمیل ۔ میں پیا نہیں ہوں گا ۔

عباس ۔ تمہیں پینا ہو گا ــــ (گلاس اُٹھاتا ہے) اسی شراب میں زہر ہے نیلم لپک کر ہاتھ سے گلاس گرا دیتی ہے ۔ عباس اُس کی کلائی پکڑ لیتا ہے ۔ نیلم کی چوڑیاں کھنکھناتی ہیں) زہر کی پڑیا واپس دیدو نیلم ۔ (نیلم) عباس کی زبردست گرفت کے باعث گر رہی ہے ۔ اور کہتی ہے میری کلائی ٹوٹ جائے گی !!) ــــ میرا دل ٹوٹ چکا ہے ــــ لاؤ ــــ یہ زہر میرے حوالے کر دو ۔ (نیلم کی ہلکی سی چیخ) ــــ بس اب ایک طرف ہو جاؤ اور ہمارا تماشہ دیکھو ــــ خبردار جمیل ــــ اپنی جگہ پر کھڑے رہو (گلاس اُٹھاتا

ہے اور اُس میں زہر کی پڑیا گھولتا ہے ۔ ، لو ۔ اس کا ایک گھونٹ پی جاؤ ——— گلاس ہاتھ میں لو ——— ورنہ ....

جمیل ۔ (ڈرتے ہوئے لہجہ میں) ——— نیلم ۔ کیا سچ مچ مجھے یہ زہر پینا پڑے گا ۔

نیلم ۔ حالات کا تقاضا یہی ہے ۔

جمیل ۔ حالات کا تقاضا ——— حالات کا تقاضا ——— مجھے حالات سے کیا واسطہ ہے ۔ مجھے کسی سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے ——— نیلم یہ کیا ہو رہا ہے ——— خدا کے لئے مجھے موت سے بچاؤ ۔

عباس ہنستا ہے

نیلم ۔ پی جاؤ ۔ میرا منہ کیا دیکھتے ہو ——— شہد سمجھ کے پی جاؤ ۔

جمیل ۔ شہد ۔ شہد ۔

عباس ۔ (بلند آواز میں) پی جاؤ ——— ورنہ ۔

نیلم ۔ پی جاؤ تمہیں کچھ نہ ہو گا ۔

جمیل ۔ کیسے ۔ کیسے ۔

عباس ۔ پی جاؤ ۔

نیلم ۔ پی جاؤ ۔ پی جاؤ ۔

عباس ۔ بس ایک گھونٹ ——— باقی میری طرف بڑھا دو ۔

نیلم ۔ پی جاؤ ۔ ڈرو نہیں ۔

جمیل ۔ پی جاؤں ؟

عباس ۔ ہاں ۔ ہاں پی جاؤ ۔

نیلم۔ پی جاؤ۔
جمیل۔ تم بھی پیو گے۔
عباس۔ وقت ضائع نہ کرو جمیل۔
نیلم۔ ڈرتے کیوں ہو۔
جمیل۔ گلاس میں سے زہر پیتا ہے۔ حلق میں غرغراہٹ پیدا ہوتی ہے
پھر کھانستا ہے)
نیلم۔ بس اتنی سی بات تھی۔
عباس۔ بس اتنی سی بات تھی ــــــ لاؤ گلاس مجھے دو ــــــ
شاباش ــــ ارے تمہارا رنگ اتنی جلدی زرد کیوں ہو گیا
ــــــ ابھی تو زہر تمہارے اندر ٹھیک طور سے
اُترا بھی نہیں۔
نیلم۔ گھبراؤ نہیں جمیل ــــ حوصلہ رکھو۔
عباس۔ حوصلہ؟ ــــ زہر پی کر یہ قسم کا حوصلہ کر سکتا ہے لو دیکھو
مٹھیاں بھینچنا شروع ہو گئیں۔
جمیل۔ عباس،۔
عباس۔ عباس کو کیوں پکارتے ہو ــــ اس کا نام نہ لو ورنہ تمہاری
جان اٹک جائے گی۔
نیلم ــــ پریشان کیوں ہوتے ہو جمیل ــــ تم نہیں مرو گے۔
جمیل۔ نیلم ــــ میں ــــ
عباس۔ (زور زور سے ہنستا ہے) ہا ہا ہا ــــ بس پانچ منٹ میں
تمہاری لاش اس فرش پر ہو گی اور مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں گی۔
تمہارے اس منحوس چھوڑے پر جو ابھی سے نیلا پڑ گیا ہے۔
جمیل۔ نیلا؟ ــــ تم قاتل ہو ــــ تم میرے قاتل ہو ــــ

میں شور مچانا شروع کر دوں گا ——— میں شور مچانا شروع کر دوں گا۔

عباس۔ کچھ فائدہ نہ ہوگا ——— چیخنے اور چلّانے سے جو کام تم کرنا چاہتے ہو وہ میں خود کرنے والا ہوں ——— اس گلاس باقی زہر ابھی میرے اندر چلا جائے گا ——— مگر تمہیں پہلے مرنا ہوگا ——— تم میری جان کنی کا تماشا نہیں دیکھو گے۔ اِس کا مزا صرف میں لونگا (ہنستا ہے) نیلم۔ ذرا اس بہادر کی حالت تو دیکھو جس کی بڑھکوں سے تمہیں پیار ہوگیا تھا (ہنستا ہے) ہا ہا ہا ——— تم کانپ رہے ہو جمیل ——— تمہارا رُواں رواں کانپ رہا ہے ——— زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ——— بس اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو۔

جمیل۔ (دیوانہ وار) ——— میں نہیں مرنا چاہتا ——— میں نہیں مرنا چاہتا۔ کوئی مجھے بچائے۔ کوئی مجھے بچائے۔

عباس۔ شریف آدمیوں کی طرح جان دو جمیل ——— یوں چیخو چلاؤ نہیں۔ موت بہت حسّاس ہوتی ہے۔

جمیل۔ موت ——— موت ———

نیلم۔ ڈرو نہیں، تم زندہ رہو گے!

عباس۔ (ہنستا ہے) تم زندہ رہو گے اس لئے کہ تم اِس صورت کیلئے اپنی جان دے رہے ہو (ہنستا ہے) ——— تمہارا رنگ اب بالکل نیلا پڑ گیا ہے۔ تمہارے ہونٹ خزاں دیدہ پتوں کے مانند کانپ رہے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بلبلوں کی اُبل رہی ہیں۔ (ہنستا ہے۔) بس اب تم چند گھڑیوں کے مہمان ہو ——— کچھ کہنا ہو تو کہہ لو نیلم سے (ہنستا ہے۔) میں کتنا خوش ہوں ——— (ہنستا ہے۔) ——— قہقہوں کے درمیان جمیل دیوانہ وار چلاتا ہے "پانی پانی

نیلم کہتی ہے "تمہیں کیا ہو گیا ہے جمیل — تم تو سچ مچ مر رہے ہو"— عباس ہنستا رہتا ہے - آخر میں دھڑام سے جمیل زمین پر گر پڑتا ہے۔)

عباس - مر گیا — لو اب میں چلا —— (اُسی گلاس میں سے زہر پیتا ہے اور ہونٹ چاٹتا ہے —— لوگ کہتے ہیں زہر کڑوا ہوتا ہے۔ مگر یہ تو میٹھا تھا۔

نیلم - جمیل! —— جمیل! —— جمیل! —— عباس! جمیل تو، سچ مچ مر گیا۔

عباس - تو کیا جھوٹ موٹ کی موت مرتا - نیلم اب اس کا ذکر نہ کرو، جو مر کھپ چکا ہے۔ میرے ساتھ باتیں کرو جو ابھی مرا نہیں ہے (ہنستا ہے۔) موت —— موت اور زندگی میں فرق ہی کیا ہے —— زندگی ایک نیند ہے جس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں، اور موت ایسی نیند ہے جس میں آنکھیں بند رہتی ہیں۔

نیلم - (آہ بھر کر) جمیل مر گیا۔

عباس - لو اب میری باری ہے۔ ایک مرد جس سے تمہیں محبت تھی۔ موت کی آغوش میں جا چکا ہے — دوسرا جس کو تم سے محبت ہے جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

نیلم - تم غلط کہتے ہو —— مجھے جمیل سے محبت نہیں تھی

عباس - پھر کس سے تھی؟

نیلم - اس کی خنک باتوں سے —— تم لوگ اتنی معمولی سی بات کیوں نہیں سمجھتے —— بادلوں میں گھرے لوگ کیا صاف آسمان کی خواہش نہیں کرتے — برف کے تودوں میں دبی ہوئی چیزیں کیا سورج کی تپش کے لئے نہیں تڑپتیں۔ زمین پر رہنے والے کیا تاروں کی،

طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتے —— کیا فرشتوں نے آسمان چھوڑ کر زمین پر آنے کی غلطی نہیں کی —— شعروں کے نرم ونازک بستر سے نکل کر حقیقت کے پتھروں سے چلنے پھرنے کی خواہش کیا دل میں پیدا نہیں ہو سکتی —— اور پھر نیلم تو ایک عورت ہے۔

عباس۔ عورتوں اور چڑیوں کا فلسفہ میری سمجھ سے ہمیشہ اونچا رہا ہے۔

نیلم۔ اس لیئے کہ تم شاعر زیادہ اور آدمی کم ہو —— عباس ہر شے کو شعریت کی نظروں سے دیکھو۔ مگر عورت کو ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھو۔

عباس۔ (ہنستا ہے) یہ دونوں آنکھیں آپ موت ہمیشہ کے لیے میچ دیگی (حیرت سے) مگر اس زہر نے مجھ پر اثر کیوں نہیں کیا۔ —— میں —— میں موت کو اپنے قریب محسوس کیوں نہیں کرتا۔ میرا حلق بھی تو خشک نہیں ہوا میرا رنگ بھی ویسے کا ویسا ہے۔

نیلم۔ اس لئے کہ تم نے زہر نہیں پیا۔

عباس۔ (حیرت سے) زہر نہیں پیا —— جمیل کیسے مرگیا؟

نیلم۔ مرگیا۔ اُس کی ہوشیاری اور چالاکی اس کی مدد نہ کر سکی —— حالانکہ میں نے تم دونوں کو بچانے کی کوشش کی تھی —— زہر کی پڑیا کے بجائے میں نے شکر کی پڑیا بڑی پھرتی سے تمہارے ہاتھ میں دیدی تھی۔

عباس۔ پہیلیاں بوجھنے کے فن سے میں بالکل کورا ہوں نیلم!

نیلم۔ اسی لئے تم مرے نہیں تھے۔ اگر جمیل نے زہر پیا ہوتا تو وہ شاید نہ مرتا۔ مگر شکر نے اُس پر زہر کا کام کیا —— اب چھوڑو ان باتوں کو وہ کھڑکی

(ہوا کے دباؤ سے کھڑکی کھل جاتی ہے، بارش کا شور سنائی دیتا ہے)

نیلم۔ کھڑکی بند کر دو عباس —— باہر رات کا اندھیرا ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیل کی رُوح اس کالی بارش میں نہا رہی ہے۔ اُف یہ کالی رات کتنی بھیانک ہے......

عباس۔ اتنی بھیانک نہیں جتنا تمہارا سفید چہرہ ہے......

(کھڑکی بند کر دیتا ہے)

سجدہ؟

گلاس پر بوتل جھکی تو ایکدم حمید کی طبیعت پر بوجھ سا پڑ گیا۔ ملک جو اُس کے سامنے تیسرا پیگ پی رہا تھا فوراً تاڑ گیا کہ حمید کے اندر روحانی کشمکش پیدا ہو گئی ہے وہ حمید کو سات برس سے جانتا تھا، اور ان سات برسوں میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے جنکا مطلب اس کی سمجھ سے ہمیشہ بالاتر رہا تھا۔ لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ اس کے لاغر دوست کے سینے پر کوئی بوجھ ہے ایسا بوجھ جس کا اثر شراب پینے کے دوران میں کبھی کبھی حمید کے اندر یوں پیدا ہوتا ہے جیسے بے دھیان بیٹھے ہوئے آدمی کی پسلیوں میں کوئی زور سے ٹہوکا دیدے۔

حمید بڑا خوش باش انسان تھا۔ ہنسی مذاق کا عادی، حاضر جواب، بذلہ سنج اس میں بہت سی خوبیاں تھیں جو زیادہ نزدیک آ کر اُس کے دوست ملک نے معلوم کی تھیں۔ مثال کے طور پر سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بیحد مخلص تھا، اس قدر مخلص کہ بعض اوقات اس کا اخلاص ملک کے لیے عہد عتیق کا رومانی افسانہ بن جاتا تھا۔

حمید کے کردار میں ایک عجیب و غریب بات جو ملک نے نوٹ کی یہ تھی کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے ناآشنا تھیں۔ یوں تو ملک بھی رونے کے

معاملے میں بڑا دخیل تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جب کبھی رو لینے کا موقع آئے گا۔ وہ ضرور رو دے گا۔ اس پر غم افزا باتیں اثر ضرور کرتی تھیں۔ مگر وہ اس اثر کو اتنی دیر اپنے دماغ پر بیٹھنے کی اجازت دیتا تھا۔ جتنی دیر گھوڑا اپنے تنے ہوئے جسم پر مکھی کو۔

غموں سے دور رہنے والے اور ہر وقت ہنسی مذاق کے عادی حمید کی زندگی میں نہ جانے ایسا کونسا واقعہ اُلجھا ہوا تھا کہ وہ کبھی کبھی قبرستان کی طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ ایسے لمحات جب اُس پر طاری ہوتے تو اُس کا چہرہ ایسی رنگت اختیار کر لیتا تھا جو تین دن کی باسی شراب میں بے جان سوڈا گھولنے سے پیدا ہوتی ہے۔

سات برس کے دوران میں کئی بار حمید پر ایسے دورے پڑ چکے تھے مگر ملک نے آج تک اُس سے اُن کی وجہ دریافت نہ کی تھی۔ اس لئے نہیں کہ ان کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش اُس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ ملک پرلے درجے کا سست اور کاہل واقع تھا۔ اس خیال سے بھی وہ حمید کے ساتھ اس معاملے پر بات چیت نہیں کرتا تھا کہ ایک طول طویل کہانی اُسے سننا پڑے گی اور اس کے چوتھے پیگ کا سارا سرور غارت ہو جائے گا۔ شراب پی کر لمبی چوڑی آپ بیتیاں" سُننا یا سنانا اس کے نزدیک بہت بڑی بدذوقی تھی۔ اس کے علاوہ کہانیاں سننے کے معاملے میں وہ بہت ہی خام تھا اسی خیال کی وجہ سے کہ وہ اطمینان سے حمید کی داستان نہیں سُن سکے گا اُس نے آج تک اُس سے اُن دوروں کی بابت دریافت نہیں کیا تھا۔

کرپارام نے حمید کے گلاس میں تیسرا پیگ ڈال کر بوتل میز پر رکھ دی اور ملک سے مخاطب ہو کر "ملک اسے کیا ہو گیا ہے"؟

ملک خاموش رہا لیکن حمید مضطرب ہو گیا۔ اُس کے تنے ہوئے اعصاب

زور سے کانپ اٹھے۔ کرپارام کی طرف دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی، اس میں جب ناکامی ہوئی تو اس کا اضطراب اور بھی زیادہ ہوگیا۔

حمید کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا اور اگر چھپا لینے کی کوشش کرتا تو اس کی وہی حالت ہوتی جو آندھی میں صرف ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی عورت کی ہوتی ہے۔

ملک نے اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور اس فضا کو جو کچھ عرصہ پہلے طرب افزا باتوں سے گونج رہی تھی اپنی بے محل ہنسی سے خوشگوار بنا دینے کے لیے اس نے کرپارام سے مخاطب ہو کر کہا: "کرپا۔ تم ان دنوں سے اشوک کمار کا فلمی عشق ہوگیا ہے — بھئی یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے۔ پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کاسٹر آئل پی رہا ہے!"

کرپارام، اشوک کمار کو اتنا ہی جانتا تھا کہ مہاراجہ اشوک اور اس کی مشہور آہنی لاٹھ کو فلم اور تاریخ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، البتہ وہ ان کے فوائد سے ضرور آگاہ تھا۔ کیونکہ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا: "مجھے، اگر کبھی بے خوابی کا عارضہ لاحق ہو جائے تو میں یا تو فلم دیکھنا شروع کر دوں گا یا چکرورتی کی لکھی ہوئی تاریخ پڑھنا شروع کر دوں گا!" وہ ہمیشہ حساب داں چکرورتی کو مورخ بنا کر اپنی مسرت کے لیے ایک بات پیدا کر لیا تھا۔

کرپارام چار پیگ پی چکا تھا۔ چار پیالہ پیگ، نشہ اس کے دماغ کی آخری منزل تک پہونچ چکا تھا آنکھیں سیکڑ کر اس نے حمید کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ کیمرے کا فوکس کر رہا ہے: "تمہارا گلاس ابھی تک ویسے کا ویسا پڑا ہے!"

حمید نے دردِ سر کے مریض کی شکل بنا کر کہا "بس اب مجھ سے زیادہ نہیں پی جائے گی۔"

"تم چغد ہو —— نہیں چغد نہیں کچھ اور ہو...... تمہیں پینا ہو گی۔ سمجھے، یہ گلاس اور اس بوتل میں جتنی پڑی ہے سب کی سب تمہیں پینا ہو گی۔ شراب سے جو انکار کرے وہ انسان نہیں حیوان ہے —— حیوان بھی نہیں، اس لئے کہ حیوانوں کو اگر انسان بنا دیا جائے تو وہ بھی اس خوبصورت شے کو کبھی نہ چھوڑیں تم سُن رہے ہو ملک —— میں نے اگر یہ ساری شراب اس کے حلق میں نہ انڈیل دی تو میرا نام کرپا رام نہیں گھسیٹا رام آرٹسٹ ہے۔"

گھسیٹا رام آرٹسٹ سے کرپا رام کو سخت نفرت تھی صرف اس لئے کہ آرٹسٹ ہو کر اُس کا نام گھسیٹا رام تھا۔

ملک کا منہ سوڈا ملی وسکی سے بھرا ہوا تھا۔ کرپا رام کی بات سُن کر وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ جس کے باعث اُس کے منہ سے ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا۔ "کرپا رام تم خدا کے لئے گھسیٹا رام آرٹسٹ کا نام نہ لیا کرو۔ میری انتڑیوں میں ایک طوفان سا مچ جاتا ہے۔ لاحول ولا، میری پتلون کا ستیاناس ہو گیا ہے لو بھئی حمید اب تو تمہیں پینا ہی پڑے گی کرپا رام، گھسیٹا رام بنے یا نہ بنے لیکن میں ضرور کرپا رام بن جاؤں اگر تم نے گلاس خالی نہ کیا —— لو پیو —— پی جاؤ —— ارے منہ کیا دیکھتے ہو، —— یہ تمہارے چہرے پر تیامت کیسی برس رہی ہے —— کرپا رام اُٹھو —— لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ زبردستی کرنا ہی پڑے گی۔"

کرپا رام اور ملک دونوں اُٹھے اور حمید کو زبردستی پلانے کی کوشش کرنے لگے۔ حمید کو روحانی کوفت تو ویسے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ جب

کرپا رام اور ملک نے اس کو جھنجھوڑنا شروع کیا تو اُسکو جسمانی اذیت پہنچی جس کے باعث وہ بے حد پریشان ہوگیا۔

اُس کی پریشانی سے کرپا رام اور ملک بہت محفوظ ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے ایک کھیل سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنا شروع کیا، کرپا رام نے گلاس پکڑ کر اس کے سر میں تھوڑی سی شراب ڈال دی اور نائیوں کے انداز میں جب اُس نے حمید کا سر سہلایا تو وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اُس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے اُس کی آواز بھرا گئی اُس کے سارے جسم میں تشنج سا پیدا ہوگیا اور ایکدم کاندھے ڈھیلے کرکے اُس نے رونی، اور مردہ آواز میں کہا: میں بیمار ہوں...... خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو۔"

کرپا رام اِسے بہانہ سمجھ کر حمید کو اور زیادہ تنگ کرنے کے لئے کوئی طریقہ نیا سوچنے والا ہی تھا کہ ملک نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے پرے ہٹا دیا۔ "کرپا اُس کی طبیعت واقعی خراب ہے..... دیکھو، تو رو رہا ہے۔"

کرپا رام نے اپنی موٹی کمر جھکا کر غور سے دیکھا۔ "ارے۔ تم تو سچ مچ رو رہے ہو۔"

حمید کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جس پر سوالوں کی، بوچھاڑ شروع ہوگئی۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ —— خیر تو ہے؟"

"یہ تم کیوں رو رہے ہو؟"

"بھئی حد ہوگئی —— ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے۔"

"کچھ سمجھ میں بھی تو آئے کیا تکلیف —— ہے تمہیں؟"

ملک، اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "بھئی مجھے معاف کردو اگر مجھ سے کوئی غلطی

ہو گئی ہو۔"

حمید نے جیب سے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ جذبات کی شدت کے باعث اُس کی قوت گویائی جواب دے گئی۔

تیسرے پیگ سے پہلے اُس کے چہرے پر رونق تھی، اُسکی باتیں سوڈے کے بلبلوں کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ تھیں مگر اب وہ باسی شراب کی طرح بے رونق تھا۔ وہ سکڑ سا گیا تھا اُس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی بھیگی ہوئی پتلون کی ہوتی ہے۔

کرسی پر وہ اس انداز سے بیٹھا تھا گویا وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہے، اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنایا گیا ہو۔

ملک کو اُس کی حالت پر بہت افسوس آیا۔ "حمید، لو اب خدا کیلئے چپ ہو جاؤ ـــــ واللہ تمہارے آنسوؤں سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ مزا تو سب کر کرا ہی ہو گیا تھا۔ مگر یوں تمہارے ایکا ایکی آنسو بہانے سے میں بہت مغموم ہو گیا ہوں ـــــ خدا جانے تمہیں کیا تکلیف ہے۔؟"

"کچھ نہیں میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھے ایسی تکلیف ہو جایا کرتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ "اب میں اجازت چاہتا ہوں۔"

کرپارام بوتل میں بچی ہوئی شراب کو دیکھتا رہا اور ملک یہ ارادہ کرتا رہا کہ حمید سے آج پوچھ ہی لے کہ وقتاً فوقتاً اُسے یہ دورے کیوں پڑتے ہیں مگر وہ جا چکا تھا۔

حمید گھر پہونچا تو اُسکی حالت پہلے زیادہ خراب تھی۔ کمرے میں چونکہ اُس کے سوا اور کوئی نہیں تھا اس لئے وہ رو بھی نہ سکتا تھا۔ اُسکی آنسوؤں

سے لبالب بھری ہوئی آنکھوں کو کرسیاں اور میزیں نہیں چھلکا سکتی تھیں
اُس کی خواہش تھی کہ اُس کے پاس کوئی آدمی موجود ہو جس کے چھیڑنے سے وہ جی بھر کے رو سکے۔ مگر ساتھ ہی اُس کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ اکیلا ہو —— ایک عجیب کش مکش اُس کے اندر پیدا ہو گئی۔

وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے۔ سامنے میز پر اس کی ایک پرانی تصویر، چمکدار فریم میں جڑی رکھی تھی۔ حمید نے اداس نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا تو سات برس اُس تصویر اور اُس کے درمیان تھان کی طرح کھلتے چلے گئے۔!

ٹھیک سات برس پہلے برسات کے انہی دنوں میں رات کو وہ ریلوے ریستوران میں ملک عبدالرحمن کے ساتھ بیٹھا تھا —— اسوقت کے حمید اور اس وقت کے حمید میں کتنا فرق تھا —— کتنا فرق تھا۔ حمید نے یہ فرق اس شدت سے محسوس کیا کہ اُسے اپنی تصویر میں ایک ایسا آدمی نظر آیا جس سے ملے اس کو ایک زمانہ گذر گیا ہے۔

اُس نے تصویر کو غور سے دیکھا تو اُس کے دل میں یہ تلخ احساس پیدا ہوا کہ انسانیت کے لحاظ سے وہ اُس کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ تصویر میں جو حمید ہے اس حمید کے مقابلے میں بدرجہا افضل و برتر ہے جو کرسی پر نیوڑھائے بیٹھا ہے۔ چنانچہ اس احساس نے اُس کے دل میں حسد بھی پیدا کر دیا۔

ایک سجدے —— صرف ایک سجدے نے اُس کا ستیاناس کر دیا تھا۔ آج سے ٹھیک سات برس پہلے کا ذکر ہے۔ برسات کے یہی دن تھے رات کو ریلوے ریستوران میں اپنے دوست ملک عبدالرحمن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ حمید کو یہ شرارت سوجھی تھی کہ بغیر بو کی شراب جن کا ایک پورا پیگ لیمونیڈ میں ملا کر اُس کو پلا دے اور وہ جب پی جائے تو آہستہ سے اُس کے کان میں کہے !!

مولانا ایک پورا پیگ آپ کے ثوابوں بھرے پیٹ میں داخل ہو چکا ہے"

بیرے سے مل ملا کر اس نے اس بات کا انتظام کر دیا تھا کہ آرڈر دینے پر لیمونیڈ کی بوتل میں جن کا ایک پیگ ڈال کر ملک کو دیدیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حمید نے وسکی پی اور ملک بظاہر بے خبری کی حالت میں جن کا پورا پیگ چڑھا گیا۔

حمید کیونکہ تین پیگ پینے کا ارادہ رکھتا تھا اس لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے پوچھا "ملک صاحب، آپ یوں بے کار نہ بیٹھئے میں تیسرا پیگ بڑی عیاشی سے پیا کرتا ہوں۔ آپ ایک اور لیمونیڈ منگوا لیجیے"

ملک رضامند ہو گیا چنانچہ ایک اور لیمونیڈ آگیا۔ اس بیرے نے اپنی طرف سے جن کا ایک پیگ ملا دیا تھا۔

ملک سے حمید کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ حمید اس شرارت سے باز رہتا مگر اُن دنوں وہ اس قدر زندہ دل اور شرارت پسند تھا کہ جب بیرا ملک کے لئے لیمونیڈ کا دوسرا گلاس لایا اور اُسکی طرف دیکھ کر مسکرایا تو وہ اس خیال سے بہت خوش ہوا کہ ایک کے بجائے دو پیگ ملک کے پیٹ کے اندر چلے جائیں گے۔

ملک آہستہ آہستہ لیمونیڈ ملی جن پیتا رہا اور حمید دل ہی دل میں۔ اُس کبوتر کی طرح گٹکتا رہا جس کے پاس ایک کبوتری آ بیٹھی ہو"

اُس نے جلدی جلدی اپنا تیسرا پیگ ختم کیا اور ملک سے پوچھا "اور پئیں گے آپ"

ملک نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "نہیں" پھر اُس نے بڑے روکھے انداز میں کہا "اگر تمہیں پینا ہے تو پیو۔ میں جاؤں گا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے"

اِس مختصر گفتگو کے بعد دونوں اٹھے۔ حمید نے دوسرے کمرے میں جا کر بل ادا کیا جب وہ رسٹوران سے باہر نکلے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی حمید کے دِل میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی کہ وہ ملک پر اپنی شرارت واضح کر دے

مگر اچھے موقع کی تلاش میں کافی وقت گذر گیا۔ ملک بالکل خاموش تھا۔ اور حمید کے اندر پھلجھڑی سی چھوٹ رہی تھی۔ بیشمار ننھی ننھی خوبصورت، اور شوخ و شنگ باتیں اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو کر بکھر رہی تھیں

وہ ملک کی خاموشی سے پریشان ہو رہا تھا اور جب اس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہ کیا تو آہستہ آہستہ اُس کی طبیعت پر ایک افسردگی سی طاری ہوگئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اُس کی شرارت اب دُم کٹی گلہری بنکر رہ گئی ہے۔

دیر تک دونوں بالکل خاموش چلتے رہے جب کمپنی باغ آیا تو ملک ایک بنچ پر متفکرانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ چند لمحات ایسی خاموشی میں گذرے کہ حمید کے دل میں وہاں سے اُٹھ بھاگنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر اُس وقت زیادہ دیر تک دبے رہنے کے باعث اس کی تمام تیزی اور طراری ماند پڑ چکی تھی۔

ملک بنچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "حمید، تم نے مجھے روحانی تکلیف پہونچائی ہے ـــــ تمہیں یہ شرارت نہیں کرنی چاہیئے تھی"۔ اُس آواز میں درد پیدا ہوگیا "تم نہیں جانتے۔ کہ تمہاری اس شرارت سے مجھے کس قدر روحانی تکلیف پہونچی ہے۔ اللہ تمہیں معاف کرے"۔

یہ کہکر وہ چلا گیا اور حمید اپنے آپ کو بڑی شدت کا گنہگار محسوس کرنے لگا۔ معافی مانگنے کا خیال اُس کو آیا تھا مگر ملک باغ سے نکل کر باہر سڑک پر پہونچ چکا تھا۔

ملک کے چلے جانے کے بعد حمید گناہ اور ثواب کے چکر میں پھنس گیا۔ شراب کے حرام ہونے کے متعلق اُس نے جتنی باتیں لوگوں سے سنی تھیں۔ سب کی سب، اُس کے کانوں میں بھنبھنانے لگیں۔

"شراب اخلاق بگاڑ دیتی ہے ـــــ شراب خانہ خراب ہے۔ شراب پی کر آدمی بے ادب اور بے حیا ہو جاتا ہے۔ شراب اسی لئے حرام ہے شراب صحت کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ اس کے پینے سے پھیپھڑے چھلنی ہو جاتے ہیں

—— شراب"

شراب، شراب کی ایک لامتناہی گردان حمید کے دماغ میں شروع ہو گئی۔ اور اس کی تمام برائیاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ گئیں۔

"سب سے بڑی برائی تو یہ ہے،" حمید نے محسوس کیا، "کہ میں نے بے ضرر شراب سمجھ کر ایک شریف آدمی کو دھوکے سے شراب پلا دی ہے۔ ممکن ہے وہ پکا نمازی اور پرہیزگار ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطی میری ہے اور سارا گناہ میرے ہی سر ہوگا مگر اسے جو روحانی تکلیف پہونچی ہے اس کا کیا ہوگا؟ واللہ باللہ میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ اسے تکلیف پہونچے۔ میں اس سے معافی مانگ لونگا اور........ لیکن اس سے معافی مانگ کر بھی تو میرا گناہ ہلکا نہیں ہوگا۔ ایک میں نے شراب پی اوپر سے اسکو دھوکہ دے کر پلائی۔"

وسکی کا نشہ اس کے دماغ میں چھائیاں لینے لگا۔ جس سے اس کا احساس گناہ گھناؤنی شکل اختیار کر گیا۔ مجھے معافی مانگنی چاہیئے مجھے شراب چھوڑ دینی چاہیئے —— مجھے گناہوں سے پاک زندگی بسر کرنی چاہیئے۔"

اس کو شراب شروع کئے صرف دو برس ہوئے تھے۔ ابھی تک وہ اس کا عادی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دوسری باتوں کے ساتھ اس پر بھی غور کیا۔ "میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤنگا۔ یہ کوئی ضروری چیز نہیں۔ میں اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں —— دنیا کہتی ہے...... دنیا کہتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ منہ سے لگی ہوئی یہ چھوٹ ہی نہیں سکتی میں اسے بالکل چھوڑ دوں گا —— میں اس خیال کو غلط ثابت کر دوں گا۔"

یہ سوچتے ہوئے حمید نے خود کو ایک ہیرو محسوس کیا۔ پھر ایکدم اس کے دماغ میں خدا کا خیال آیا جس نے اسے تباہی سے بچا لیا تھا۔ مجھے شکر بجا لانا چاہیئے کہ میرے سینے میں نور پیدا ہو گیا ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اس کھائی میں پڑا رہتا۔

وہ اپنی گلی میں پہونچ چکا تھا۔ اوپر آسمان پر گدلے بادلوں میں چاند صابن کے جھاگ لگے گالوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہوا خنک تھی۔ فضا بالکل خاموش تھی۔ حمید پر خدا کے رعب اور شراب نوشی سے بچ جانے کے احساس نے رقت طاری کر دی۔ اُس نے شکرانے کا سجدہ کرنا چاہا۔ وہیں پتھریلی زمین پر اُس نے گھٹنے ٹیک کر ماتھا رگڑنا چاہا۔ اسے خیال ہوا کہ کوئی اسے دیکھ لے گا۔ وہ کچھ دیر کے لئے ٹھٹک گیا۔ مگر فوراً ہی یہ سوچ کر کہ یوں خدا کی نگاہوں میں اس کی وقعت، بڑھ جائے گی وہ ڈبکی لگانے کے انداز میں جھکا اور اپنی پیشانی گلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھریلے فرش کے ساتھ جوڑ دی۔

جب وہ اُٹھا تو اُس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑا آدمی محسوس کیا۔ اُس نے جب آس پاس کی اونچی دیواروں دیواروں کو دیکھا تو وہ اسے اپنے قد کے مقابلے میں بہت پست معلوم ہوئیں۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ مہینے بعد اسی کمرے میں جہاں اب حمید بیٹھا اپنی سات برس کی پرانی تصویر پر رشک کھا رہا تھا۔ اُس کا دوست ملک آیا۔ اندر آتے ہی اُس نے اپنی جیب سے بلیک اینڈ وائٹ کا ادھا نکالا اور زور سے میز پر رکھ کر کہا "آؤ، حمید۔ آج پئیں اور خوب پئیں۔ یہ ختم ہو جائے گی تو اور لائیں گے۔"

حمید اس قدر متحیر ہوا کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ملک نے دوسری جیب سے سوڈے کی بوتل نکالی، تپائی پر سے گلاس اُٹھا کر اس پر شراب انڈیلی سوڈے کی بوتل انگوٹھے سے کھولی، اور حمید کی متحیر آنکھوں کے سامنے وہ دو پیگ غٹاغٹ پی گیا۔

حمید نے تتلاتے ہوئے کہا "لیکن ...... لیکن ...... اُس روز تم نے مجھے اتنا بُرا بھلا کہا تھا ......"

ملک نے ایک قہقہہ بلند کیا "تم نے مجھ سے شرارت کی، میں نے بھی اس

کے جواب میں تم سے شرارتاً کچھ کہہ دیا۔ مگر یہی ایمان کی بات ہے جو مزہ اُس روز جن کے وہ پیگ پینے میں آیا ہے زندگی بھر کبھی نہیں آئیگا۔ تو اب چھوڑو اس قصے کو۔ وسکی ہو یا جن دان کو اس سے شراب پینی ہو تو وسکی پینی چاہیئے"

یہ سُن کر حمید کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ سجدہ اُس نے گلی میں کیا تھا۔ ٹھنڈے فرش سے نکل کر اُس کی پیشانی پر چپک گیا ہے۔

یہ سجدہ بھوت کی طرح حمید کی زندگی سے چمٹ گیا تھا۔ اُس نے اِس سے نجات حاصل کرنے کیلئے پھر پینا شروع کیا۔ مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔

ان سات برسوں میں جو اُس کی پُرانی تصویر اور اس کے درمیان کھلے ہوئے تھے یہ ایک سجدہ بے شمار مرتبہ حمید کو اس کی اپنی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کر چکا تھا۔ اُس کی خودی، اُس کی تخلیقی قوت، اُس کی زندگی کی وہ حرارت جس سے حمید اپنے ماحول کو گرما کے رکھنا چاہتا تھا اس سجدے نے قریب قریب سرد کر دی تھی یہ سجدہ اُس کی زندگی میں ایک ایسی خراب بریک بن گئی تھی جو کبھی کبھی اپنے آپ کو اس کے چلتے ہوئے پہیوں کو ایک دھکے کے ساتھ ٹھہرا دیتی تھی۔

سات برس کی پُرانی تصویر اُس کے سامنے میز پر تھی۔ جب سارا واقعہ اُس کے دماغ میں پوری تفصیل کے ساتھ دُہرایا جا چکا تو اُس کے اندر ایک ناقابلِ بیان اضطراب پیدا ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اُسکو قے ہونے والی ہے۔

وہ گھبرا کر اُٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اُس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اُس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کُرسی پر بیٹھ گیا —— سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اُس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا: "اے خدا میرا سجدہ مجھے واپس دے دے۔۔۔۔۔۔"

ترقی پسند

جوگندر سنگھ کے افسانے جب مقبول ہونا شروع ہوئے تو اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ کہ وہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلائے۔ اور اُن کی دعوت کرے اس کا خیال تھا کہ یوں اُس کی شہرت اور مقبولیت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔

جوگندر سنگھ بڑا خوش فہم انسان تھا۔ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلا کر اور ان کی خاطر تواضع کرنے کے بعد جب وہ اپنی بیوی امرت کور کے پاس بیٹھتا تو کچھ دیر کے لیے بالکل بھول جاتا کہ اس کا کام ڈاک خانہ میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اپنی تین گزی پٹیالہ فیشن کی رنگی ہوئی پگڑی اتار کر جب وہ ایک طرف رکھ دیتا تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کے لمبے لمبے کالے گیسوؤں کے نیچے جو چھوٹا سا سر چھپا ہوا ہے اُس میں ترقی پسند، ادب کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اس احساس سے اُس کے دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کی اہمیت پیدا ہو جاتی اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جس قدر افسانہ نگار اور ناول نویس موجود ہیں سب کے سب اس کے ساتھ ایک نہایت ہی لطیف رشتے کے ذریعہ سے منسلک ہیں۔

امرت کور کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اُس کا خاوند لوگوں کو مدعو کرنے پر اس سے ہر بار یہ کیوں کہا کرتا ہے: "امرت، یہ جو آج چائے پر آ رہے ہیں

ہندوستان کے بڑے شاعر ہیں سمجھیں۔ بہت بڑے شاعر۔ دیکھو انکی خاطر تواضع میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔"

آنے والا کبھی ہندوستان کا بہت بڑا شاعر ہوتا تھا۔ یا بہت بڑا افسانہ نگار اس سے کم پائے کا آدمی وہ کبھی بلاتا ہی نہیں تھا۔ اور پھر دعوت میں، اونچے اونچے سُروں میں جو باتیں ہوتی تھیں اُن کا مطلب وہ آج تک نہ سمجھ سکی تھی ان گفتگوؤں میں ترقی پسند کا ذکر عام ہوتا تھا اس ترقی پسندی کا مطلب بھی امرت کور کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔

ایک دفعہ جوگندر سنگھ ایک بہت بڑے افسانہ نگار کو چائے پلا کر فارغ ہوا اور اندر رسوئی میں آکر بیٹھا تو امرت کور نے پوچھا "یہ موئی ترقی پسندی کیا ہے؟"

جوگندر سنگھ نے پگڑی سمیت اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور کہا "یہ ترقی پسندی...... اس کا مطلب تم فوراً ہی نہ سمجھ سکوگی۔ ترقی پسند اس کو کہتے ہیں جو ترقی پسند کرے۔ یہ لفظ فارسی کا ہے۔ انگریزی میں ترقی پسند کو ریڈیکل کو کہتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار یعنی کہانیاں لکھنے والے، جو افسانہ نگاری میں ترقی چاہتے ہوں ان کو ترقی پسند افسانہ نگار کہتے ہیں اسوقت ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں جن میں میرا نام بھی شامل ہے۔"

جوگندر سنگھ عادتاً انگریزی لفظوں اور جملوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اُس کی یہ عادت یہاں تک کہ اب طبیعت بن گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ بلاتکلف ایک ایسی انگریزی زبان میں سوچتا تھا جو چند مشہور انگریزی ناول نویسوں کے اچھے اچھے چست فقروں پر مشتمل تھی عام گفتگو میں وہ پچاس فیصدی انگریزی لفظ اور انگریزی کتابوں سے چنے ہوئے فقرے استعمال کرتا تھا۔ افلاطون کو وہ ہمیشہ پلیٹو کہتا تھا اسی طرح کو ارسطو ارسٹوٹل۔ ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ شوپنہار اور نطشے کا ذکر وہ اپنی ہر عمر کے کی گفتگو میں کیا کرتا تھا۔ عام بات چیت میں وہ ان فلسفیوں کا نام نہیں لیتا

تھا اور بیوی سے گفتگو کرتے وقت وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا کہ انگریزی لفظ اور یہ فلسفی نہ آنے پائیں۔

جوگندر سنگھ سے جب اس کی بیوی نے ترقی پسندی کا مطلب سمجھا تو اُسے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ترقی پسندی کوئی بہت بڑی چیز ہوگی جس پر بڑے بڑے شاعر اور افسانہ نگار اس کے خاوند کے ساتھ مل کر بحث کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اُس نے یہ سوچا کہ ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں تو اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی۔ یہ چمک دیکھ کر جوگندر سنگھ کے مونچھوں بھرے ہونٹ ایک دبی دبی سی مسکراہٹ کے باعث کپکپائے "امرت....... تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا آدمی مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے اُس نے میرے افسانے پڑھے ہیں اور بہت پسند کئے ہیں"

امرت کور نے پوچھا "یہ بڑا آدمی کوئی ہے یا آپ کی طرح کہانیاں لکھنے والا"

جوگندر سنگھ نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اُسے اپنے دوسرے ہاتھ کی پشت پر تھپتھپاتے ہوئے کہا "یہ آدمی کوئی بھی ہے افسانہ نگار ہے، لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی جو اس کی نہ مٹنے والی شہرت کا باعث ہو رہی ہے"

"خوبی کیا ہے؟"

"وہ ایک آوارہ گرد ہے"

"آوارہ گرد؟"

"ہاں ایک آوارہ گرد ہے جس نے آوارہ گردی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے ــــ وہ ہمیشہ گھومتا رہتا ہے۔ کبھی کشمیر کی ٹھنڈی وادیوں میں ہوتا ہے اور کبھی ملتان کے تپتے ہوئے میدانوں میں۔ کبھی لنکا میں کبھی تبت میں......"

امرت کور کی دلچسپی بڑھ گئی "مگر یہ کرتا کیا ہے؟"
"گیت اکٹھے کرتا ہے ___ ہندوستان کے ہر حصے کے گیت ___ پنجابی، گجراتی، مرہٹی، پشاوری، سرحدی، کشمیری، مارواڑی .... ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، اُن کے جتنے گیت اسکو ملتے ہیں۔ اکٹھے کرلیتا ہے"
"وہ اتنے گیت اکٹھے کر کے کیا کرے گا؟"
"کتابیں چھاپتا ہے، مضمون لکھتا ہے تاکہ دوسرے بھی یہ گیت سُن سکیں انگریزی زبان کے کئی رسالوں میں اس کے مضمون چھپ چکے ہیں۔ گیت اکٹھے کرنا اور سلیقے کے ساتھ اُن کو پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ امرت بہت بڑا آدمی ہے اور دیکھو اُس نے مجھے کیسا لکھا ہے"
یہ کہکر جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کو وہ خط پڑھ کر سُنایا جو ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے اُس کو اپنے گاؤں سے ڈاکخانہ کے پتے سے بھیجا تھا۔ اس خط میں ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے بڑی میٹھی زبان میں جوگندر سنگھ کے افسانوں کی تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ آپ ہندوستان کے ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ جب یہ فقرہ جوگندر سنگھ نے پڑھا تو بول اٹھا "لو دیکھو ترپاٹھی صاحب بھی لکھتے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں"
جوگندر سنگھ نے پورا خط سُنانے کے بعد ایک دو سکینڈ اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اثر معلوم کرنے کے لئے پوچھا "کیوں ___؟"
امرت کور اپنے خاوند کی تیز نگاہی کے باعث کچھ جھینپ سی گئی اور مسکرا کر کہنے لگی "مجھے کیا معلوم ___ بڑے آدمیوں کی باتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں"
جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کی اس ادا پر غور نہ کیا۔ وہ دراصل ہرندر ناتھ ترپاٹھی کو اپنے یہاں بلانے اور اُسے کچھ دیر ٹھہرانے کی بابت سوچ رہا تھا۔
"امرت میں کہتا ہوں ترپاٹھی صاحب کو دعوت دے دی جائے کیا خیال ہے تمہارا ..... لیکن میں سوچتا یہ ہوں کیا پتہ ہے وہ انکار کردے ___

بہت بڑا آدمی ہے، ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔"

ایسے موقعوں پر وہ بیوی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا تاکہ دعوت کا بوجھ دو آدمیوں میں بٹ جائے۔ چنانچہ جب اس نے "ہماری" کہا تو امرت کور نے جو اپنے خاوند جوگندر سنگھ کی طرح بے حد سادہ لوح تھی ہرندر ناتھ ترپاٹھی سے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ حالانکہ اس کا نام ہی اس کے لیے ناقابلِ فہم تھا اور یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایک آوارہ گرد گیت جمع کر کے کیسے بہت بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ جب اس سے یہ کہا گیا تھا کہ ہرندر ناتھ ترپاٹھی گیت جمع کرتا ہے تو اسے اپنے خاوند کی ایک سنائی ہوئی بات یاد آگئی تھی کہ ولایت میں لوگ تیتریاں پکڑنے کا کام کرتے ہیں اور پھر کافی روپیہ کماتے ہیں۔ چنانچہ اس نے خیال کیا تھا کہ شاید ترپاٹھی صاحب نے گیت جمع کرنے کا کام ولایت کے کسی آدمی سے سیکھا ہوگا۔

جوگندر سنگھ نے پھر اپنا اندیشہ ظاہر کیا، "ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔"

"اس میں خوشامد کی کیا بات ہے اور بھی تو کئی بڑے آدمی آپ کے پاس آتے ہیں۔ آپ ان کو خط لکھ دیجیے۔ میرا خیال ہے وہ آپ کی دعوت ضرور قبول کر لیں گے اور پھر ان کو بھی تو آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ ہاں یہ تو بتائیے کیا ان کے بیوی بچے ہیں؟"

"بیوی بچے؟"، جوگندر سنگھ اٹھا، خط کا مضمون انگریزی زبان میں سوچتے ہوئے کہا "ہوں گے۔ ضرور ہوں گے۔ ہاں ہیں۔ میں نے ان کے ایک مضمون میں پڑھا تھا، ان کی بیوی بھی ہے اور ایک بچی بھی ہے۔"

یہ کہہ کر جوگندر سنگھ اٹھا، خط کا مضمون اس کے دماغ میں مکمل ہو چکا تھا دوسرے کمرے میں جا کر اس نے چھوٹے سائز کا پیڈ نکالا جس پر وہ خاص خاص آدمیوں کو خط لکھا کرتا تھا۔ اور ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے نام انگریزی میں دعوت نامہ لکھا۔ یہ اس مضمون کا ترجمہ [illegible] اپنی بیوی سے [illegible] گزرتے وقت جا [illegible]

تیسرے روز ہرندرناتھ ترپاٹھی کا جواب آیا۔ جوگندر سنگھ نے دھڑکتے ہوئے دل سے لفافہ کھولا۔ جب اُس نے پڑھا کہ اُس کی دعوت قبول کرلی گئی ہے تو اُس کا دل اور بھی دھڑکنے لگا۔ اُسکی بیوی امرت کور دھوپ میں اپنے چھوٹے بچے کے کیسوں میں ڈال کر رہی تھی کہ جوگندر سنگھ لفافہ ہاتھ میں لے کر اُس کے پاس پہونچا "انہوں نے ہماری دعوت قبول کرلی" کہتے ہیں کہ وہ لاہور یوں بھی ایک ضروری کام سے آرہے تھے۔ اپنی تازہ کتاب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں......

اور ہاں انہوں نے تم کو پرنام لکھا ہے"

امرت کور کو اس احساس سے بہت خوشی ہوئی کہ اتنے بڑے آدمی نے جس کا کام گیت اکٹھے کرنا ہے اس کو پرنام کیا ہے چنانچہ اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کا بیاہ ایسے آدمی سے ہوا جس کو ہندوستان کا ہر بڑا آدمی جانتا ہے۔

سردیوں کا موسم تھا نومبر کے پہلے دن تھے جوگندر سنگھ صبح سات بجے بیدار ہوگیا اور دیر تک بستر میں آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ اُس کی بیوی امرت کور اور اُس کا بچہ دونوں لحاف میں لپٹے ہوئے پاس والی چارپائی پر پڑے تھے۔ جوگندر سنگھ نے سوچنا شروع کیا۔ ترپاٹھی صاحب سے مل کر اُسے کتنی خوشی حاصل ہوگی۔ اور خود ترپاٹھی صاحب کو بھی یقیناً اُس سے مل کر بڑی مسرت حاصل ہوگی کیونکہ وہ ہندوستان کا جواں فنکار افسانہ نویس اور ترقی پسند ادیب ہے۔ ترپاٹھی صاحب سے وہ ہر موضوع پر گفتگو کرے گا۔ گیتوں پر، ہماری بولیوں پر، افسانوں پر اور تازہ جنگی حالات پر — وہ ان کو بتائے گا کہ وہ ڈاکخانہ کا ایک محنتی کلرک ہونے پر بھی وہ کیسے اچھا افسانہ نگار بن گیا کیا یہ عجیب سی بات نہیں کہ ڈاکخانہ میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنے والا انسان اچھا آرٹسٹ ہو

جوگندر سنگھ کو اس بات پر بہت ناز تھا کہ ڈاکخانہ میں مزدوروں کی طرح چھ سات گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی وہ اپنا وقت نکال لیتا ہے کہ ایک افسانہ

پرچہ مرتب کرتا ہے اور دو تین پرچوں کے لئے ہر مہینے ایک افسانہ بھی لکھتا ہے دوستوں کو ہر ہفتے جو لمبے چوڑے خط لکھے جاتے تھے، اُن کا ذکر الگ رہا۔

دیر تک وہ بستر پر لیٹا ہرندر ناتھ ترپاٹھی سے اپنی پہلی ملاقات کی ذہنی تیاریاں کرتا رہا جوگندر سنگھ نے اُس کے افسانے اور مضمون پڑھے تھے اور اُس کا فوٹو بھی دیکھا تھا اور کسی کے افسانے پڑھ کر اور فوٹو دیکھ کر وہ عام طور پر یہی محسوس کیا کرتا تھا۔ کہ اُس نے اُس آدمی کو اچھی طرح جان لیا ہے لیکن ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے معاملے میں اسکو اپنے اوپر اعتبار نہیں آتا تھا۔ کبھی اُس کا دل کہتا تھا کہ ترپاٹھی اس کے لیئے بالکل اجنبی ہے اُس کے افسانہ نگار دماغ میں بعض اوقات ترپاٹھی ایک ایسے آدمی کی صورت میں پیش ہوتا تھا جس نے کپڑوں کے بجائے اپنے جسم پر کاغذ لپیٹ رکھے ہوں، اور جب وہ کاغذوں کے متعلق سوچتا تھا تو اُسے انارکلی کی وہ دیوار یاد آجاتی تھی جس پر سینما کے اشتہار اوپر تلے اتنی تعداد میں چپکے ہوئے تھے کہ ایک اور دیوار بن گئی تھی۔

جوگندر سنگھ بستر پر لیٹا دیر تک سوچتا رہا کہ اگر وہ ایسا ہی آدمی نکل آیا تو اُس کو سمجھنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ مگر بعد میں جب اس کو اپنی ذہانت کا خیال آیا تو اُس کی مشکلیں آسان ہو گئیں اور وہ اٹھ کر ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

خط و کتابت کے ذریعے سے یہ طے ہو گیا ہے کہ ہرندر ناتھ ترپاٹھی خود جوگندر سنگھ کے مکان پر چلا آئے گا کیونکہ ترپاٹھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا۔ تھا کہ وہ لاری سے سفر کرے گا یا ریلوے ٹرین سے۔ بہر حال یہ بات تو قطعی طور پر طے ہو گئی تھی کہ جوگندر سنگھ سوموار کو ڈاکخانہ سے چھٹی لیکر سارا دن اپنے مہمان کا انتظار کرے گا۔

نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر جوگندر سنگھ دیر تک باورچی خانہ میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھا رہا۔ دونوں نے چاء دیر سے پی، اس خیال سے کہ

شاید ترپاٹھی آجائے۔ لیکن جب وہ نہ آیا تو انہوں نے کیک، وغیرہ“ سنبھال کر الماری میں رکھ دیئے اور خود خالی چائے پی کر مہمان کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

جوگندر سنگھ باورچی خانے سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اُس نے اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں لوہے کے چھوٹے چھوٹے کلپ اٹکانے شروع کئے کہ وہ نیچے کی طرف تہہ ہو جائیں تو باہر دروازے پر دستک ہوئی ڈاڑھی کو ویسے ہی نامکمل حالت میں چھوڑ کر اُس نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ جیسا کہ اس کو معلوم تھا سب سے پہلے اُس کی نظر ہرندر ناتھ ترپاٹھی کی سیاہ گھنی ڈاڑھی پر پڑی جو اُس کی ڈاڑھی سے بیس گنا بڑی تھی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

ہرندر ناتھ کے ہونٹوں پر جو بڑی بڑی مونچھوں کے اندر چھپے ہوئے تھے مسکراہٹ پیدا ہوئی اُس کی ایک آنکھ جو قدرے ٹیڑھی تھی، زیادہ ٹیڑھی ہو گئی اور اُس نے اپنی لمبی لمبی زلفوں کو ایک طرف جھٹک کر اپنا ہاتھ جو کسی کسان کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا جوگندر سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

جوگندر سنگھ نے جب اُس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت محسوس کی اور اس کو ترپاٹھی کا وہ چرمی تھیلا نظر آیا جو حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا تھا۔ وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکا: ”ترپاٹھی صاحب آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہے۔“

ہرندر ناتھ ترپاٹھی کو آئے اب پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اسکی آمد کے دوسرے روز ہی اُس کی بیوی اور بچی بھی آگئی تھیں۔ یہ دونوں ترپاٹھی کے ساتھ ہی گاؤں سے آئی تھیں مگر دوروز کے لئے مزنگ میں ایک دور کے رشتے دار کے ہاں ٹھہر گئی تھیں اور چونکہ ترپاٹھی نے اس رشتہ دار کے پاس اُٹھنا زیادہ دیر تک

ٹھیرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔

پہلے چار دن بڑی دلچسپ باتوں میں صرف ہوئے۔ ہرندرناتھ ترپاٹھی سے اپنے افسانوں کی تعریف سنکر جوگندر بہت خوش ہوتا رہا۔ اُس نے ایک مکمل افسانہ جو کہ غیر مطبوعہ تھا ترپاٹھی کو سنایا اور داد حاصل کی۔ دو نامکمل افسانے بھی سنائے جن کے متعلق ترپاٹھی نے اچھی رائے کا اظہار کیا۔ ترقی پسند ادب پر بھی بحثیں ہوتی رہیں۔ مختلف افسانہ نگاروں کی فنی کمزوریاں نکالی گئیں۔ نئی اور پرانی شاعری کا مقابلہ کیا گیا۔ غرضیکہ یہ چار دن بڑی اچھی طرح گذرے اور جوگندر سنگھ ترپاٹھی کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اُس کی گفتگو کا انداز جس میں بیک وقت بچپنا اور بڑھاپا تھا جوگندر کو بہت پسند آیا اسکی لمبی داڑھی جو اُس کی اپنی داڑھی سے بیس گنا بڑی تھی اسکے خیالات پر چھاگئی اور اس کالی کالی زلفیں جن میں دیہاتی گیتوں کی روانی تھی ہر وقت اُسکی آنکھوں کے سامنے رہنے لگیں ڈاکخانہ میں چھٹیوں کی دیکھ بھال کرنے کے دوران میں بھی ترپاٹھی کی یہ زلفیں اُسے نہ بھولتیں۔

چار دن میں ترپاٹھی نے جوگندر سنگھ کو موہ لیا۔ وہ اُس کا گرویدہ ہو گیا۔ اُس کی ٹیڑھی آنکھ میں بھی اُسکو خوبصورتی نظر آنے لگی۔ بلکہ ایک بار تو اُس نے سوچا۔ اگر اُنکی آنکھ میں ٹیڑھا پن نہ ہوتا تو چہرے پر یہ بزرگی کبھی پیدا نہ ہوتی۔

ترپاٹھی کے بڑے بڑے ہونٹ جب ترپاٹھی کی گھنی مونچھوں کے پیچھے ہلتے تو جوگندر ایسا محسوس کرتا کہ جھاڑیوں میں پرندے بول رہے ہیں۔ ترپاٹھی ہولے ہولے بولتا تھا اور بولتے بولتے جب وہ اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا تو جوگندر کے دل کو بہت راحت پہونچتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُس کے دل پر پیار سے ہاتھ پھیرا جا رہا ہے۔

چار روز تک جوگندر ایسی فضا میں رہا جسکو اگر وہ اپنے کسی، افسانے

میں بھی بیان کرنا چاہتا تو نہ کرتا۔ لیکن پانچویں روز ایکا ایکی، ترپاٹھی نے اپنا تھیلا چرمی کھولا اور اُس کو اپنے افسانے سنانے شروع کیے اور دس روز تک متواتر وہ اُسکو اپنے افسانے سناتا رہا اس دوران میں ترپاٹھی نے جوگندر کو کئی کتابیں سنا دیں۔

جوگندر سنگھ تنگ آگیا۔ اب اُس کو افسانوں سے نفرت پیدا ہو گئی ترپاٹھی کا چرمی تھیلا جس کا پیٹ بنیوں کی توند کی طرح پھولا ہوا تھا اس کے لئے ایک مستقل عذاب بن گیا۔ ہر روز شام کو دفتر سے لوٹتے ہوئے اُسے اس بات کا کھٹکا رہنے لگا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کی ترپاٹھی سے ملاقات ہو گی۔ اِدھر اُدھر کی چند سرسری باتیں ہونگی، وہ چرمی تھیلا کھولا جائے گا اور اسکو ایک یا دو طویل افسانے سنا دیے جائیں گے۔

جوگندر سنگھ ترقی پسند تھے۔ یہ ترقی پسندی اگر اُسکے اندر نہ ہوتی تو وہ صاف لفظوں میں ترپاٹھی سے کہہ دیتا "بس۔بس۔ ترپاٹھی صاحب بس۔ بس اب مجھ میں آپ کے افسانے سننے کی طاقت نہیں رہی"۔ مگر وہ سوچتا، "نہیں نہیں — میں ترقی پسند ہوں مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے در اصل یہ میری کمزوری ہے کہ اب اُن کے افسانے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ اُن میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبی ہو گی...... اس لئے کہ ان کے پہلے افسانے مجھے خوبیوں سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے........ میں...... میں متعصب ہو گیا ہوں"۔

ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک جوگندر سنگھ کے ترقی پسند دماغ میں یہ کشمکش جاری رہی اور وہ سوچ سوچ کر اس حد تک پہونچ گیا جہاں سوچ بچار ہو ہی نہیں سکتا۔ طرح طرح کے خیال اُس کے دماغ میں آتے مگر وہ ٹھیک طور پر اُن کی جانچ پڑتال نہ کرسکتا۔ اُس کی ذہنی" افراتفری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ ایک بہت بڑا مکان ہے جس میں بے شمار کھڑکیاں ہیں۔ اس مکان کے اندر وہ اکیلا ہے۔ آندھی آگئی ہے، کبھی اس کھڑکی کے پٹ بجتے ہیں، کبھی اُس کھڑکی کے

اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنی کھڑکیوں کو ایکدم بند کیسے کرے۔

جب ترپاٹھی کو اُس کے یہاں آئے بیس روز ہو گئے تو اُسے بےچینی محسوس ہونے لگی۔ ترپاٹھی اب شام کو نیا افسانہ لکھ کر جب اُسے سناتا تو جوگندر کو ایسا محسوس ہوتا کہ بہت سی مکھیاں اُس کے کانوں کے پاس بھنبھنا رہی ہیں وہ کسی اور ہی سوچ میں غرق ہوتا۔

ایک روز ترپاٹھی نے جب اُسکو اپنا تازہ افسانہ سُنایا۔ جس میں کسی عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کا ذکر تھا یہ سوچ کر اُس کے دل کو دھکا سا لگا کہ پورے اکیس دن اپنی بیوی کے پاس سونے کے بجائے وہ ایک لم ڈھیل کے ساتھ ایک ہی لحاف میں سوتا رہا ہے۔ اس احساس نے جوگندر کے دماغ و دل میں ایک لمحہ کے لیئے انقلاب برپا کر دیا۔ یہ کیسا مہمان ہے کہ جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا ہے یہاں سے ہلنے کا نام ہی نہیں لیتا........ اور...... اور........ میں اُن کی بیوی صاحبہ تو بھول ہی گیا تھا اور ان کی بچی........ سارا گھر اٹھا کر چلا آیا ہے۔ ذرہ بھر خیال نہیں کہ ایک غریب، آدمی کا کچومر نکل جائے گا —— میں ڈاکخانہ میں ملازم ہوں، صرف، پچاس روپیہ ماہوار کماتا ہوں، آخر کب تک اُسکی خاطر تواضع کرتا رہوں گا اور پھر افسانے...... اس کے افسانے جو کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے۔ میں انسان ہوں لوہے کا ٹرنک نہیں ہوں جو ہر روز اُس کے افسانے سنتا رہوں....... اور کس قدر غضب ہے کہ میں اپنی بیوی کے پاس تک نہیں گیا... سردیوں کی یہ راتیں ضائع ہو رہی ہیں"۔

اکیس دنوں کے بعد جوگندر ترپاٹھی کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اب اسکو ترپاٹھی کی ہر چیز معیوب نظر آنے لگی اس کی ٹیڑھی آنکھ جس میں جوگندر پہلے خوبصورتی دیکھتا تھا اب صرف ایک ٹیڑھی آنکھ تھی۔ اُسکی کالی زلفوں میں بھی اب جوگندر کو وہ ملائمی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اور اس کی داڑھی دیکھکر اب وہ سوچتا تھا کہ اتنی لمبی داڑھی رکھنا بہت بڑی حماقت ہے۔

جب ترپاٹھی کو اُس کے یہاں آئے پچیس دن ہو گئے تو ایک عجیب و غریب کیفیت اس کے اوپر طاری ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کبھی جوگندر سنگھ کو جانتا تھا مگر اب نہیں جانتا اپنی بیوی کے متعلق وہ سوچتا: "جب ترپاٹھی چلا جائے گا اور سب ٹھیک ہو جائیگا تو میری سرے سے شادی ہو گی ۔۔۔ میری وہ پرانی زندگی جس کو ٹاٹ کے طور پر یہ لوگ، استعمال کر رہے ہیں پھر عود کر آئے گی۔ ...... میں پھر اپنی بیوی کے ساتھ سو سکوں گا ...... اور ......"

اس کے آگے جب وہ سوچتا تو جوگندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور اُس کے حلق میں کوئی تلخ سی چیز پھنس جاتی۔ اسکا جی چاہتا کہ دوڑا دوڑا اندر آجائے اور امرت کور کو جو کبھی اسکی بیوی ہوا کرتی تھی اپنے گلے سے لگا لے اور رونا شروع کردے مگر ایسا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی کیونکہ وہ ترقی پسند افسانہ نگار تھا

کبھی کبھی جوگندر سنگھ کے دل میں یہ خیال دودھ کے اُبال کی طرح اٹھتا کہ ترقی پسندی کا لحاف جو اس نے اوڑھ رکھا ہے اتار پھینکے اور چلانا شروع کردے ترپاٹھی "ترقی پسندی کی ایسی تیسی۔ تم اور تمہارے اکٹھے کئے ہوئے گیت بکواس ہیں ۔۔ مجھے اپنی بیوی چاہیئے ...... تمہاری خواہشیں تو ساری گیتوں میں جذب ہو چکی ہیں۔ مگر میں ابھی نوجوان ہوں ..... میری حالت پر رحم کرو ...... ذرا غور تو کرو میں جو ایک منٹ اپنی بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا پچیس دنوں سے تمہارے ساتھ ایک ہی لحاف میں سو رہا ہوں ...... کیا یہ ظلم نہیں"

جوگندر سنگھ بس گھل کے رہ جاتا۔ ترپاٹھی اسکی حالت سے بے خبر ہر روز شام کو تازہ افسانہ اُسے سنا دیتا اور اس کے ساتھ لحاف میں سو جاتا۔ جب ایک مہینہ گذر گیا تو جوگندر سنگھ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ موقع پا کر غسل خانے میں وہ اپنی بیوی سے ملا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس ڈر کے مارے کہ ترپاٹھی کی بیوی نہ آجائے اُس نے جلدی سے اُس کا یوں بوسہ لیا جیسے ڈاکخانہ میں لفافوں پر مہر لگائی جاتی ہے اور کہا "آج رات

تم جاگتی رہنا۔ میں ترپاٹھی سے یہ کہکر باہر جارہا ہوں کہ رات کے ڈھائی بجے واپس آؤں گا لیکن میں جلدی آجاؤں گا بارہ بجے — پورے بارہ بجے۔ میں ہولے ہولے دستک دونگا تم چپکے سے دروازہ کھول دینا اور پھر ہم ...... ڈیوڑھی بالکل الگ تھلگ ہے۔ لیکن تم احتیاط کے طور پر وہ دروازہ جو غسلخانے کی طرف کھلتا ہے بند کر دینا۔"

بیوی کو اچھی طرح سمجھا کر وہ ترپاٹھی سے ملا اور اُس سے رخصت لیکر چلا گیا۔ بارہ بجنے میں چار سرد گھنٹے باقی تھے جن میں سے دو جوگندر سنگھ نے اپنی سائیکل پر ادھر اُدھر گھومنے میں کاٹے۔ اسکو سردی کی شدت کا بالکل احساس نہ ہوا اسلئے کہ بیوی سے ملنے کا خیال کافی گرم تھا۔

دو گھنٹے سائیکل پر گھومنے کے بعد وہ اپنے مکان کے پاس میدان میں بیٹھ گیا اور محسوس کرنے لگا کہ وہ رومانی ہو گیا ہے جب اس نے سرد رات کی دھندیالی خاموشی کا خیال کیا تو اُسے یہ ایک جانی پہچانی چیز معلوم ہوئی۔ اوپر ٹھٹھرے ہوئے آسمان پر تارے چمک رہے تھے جیسے پانی کی موٹی موٹی بوندیں جم کر موتی بن گئی ہیں کبھی کبھی ریلوے انجن کی چیخ خاموشی کو چھیڑ دیتی اور جوگندر سنگھ کا افسانہ نگار دماغ یہ سوچتا کہ خاموشی بہت بڑا برف کا ڈھیلا ہے اور سیٹی کی آواز مینخ ہے جو اُس کے سینے میں کھُب گئی ہے۔

بہت دیر تک جوگندر ایک نئے قسم کے رومان کو اپنے دل و دماغ میں پھیلاتا رہا اور رات کی اندھیاری خوبصورتیوں کو گنتا رہا۔ ایکا ایکی ان خیالات سے چونک کر اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو بارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ اُٹھ کر اُس نے گھر کا رخ کیا اور دروازے پر ہولے سے دستک دی پانچ سکنڈ گذر گئے دروازہ نہیں کھلا۔ ایکبار پھر اُس نے دستک دی دروازہ کھلا۔ جوگندر سنگھ نے ہولے سے کہا "امرت ......" اور جب نظریں اٹھا کر اُس نے دیکھا تو امرت کور کے بجائے ترپاٹھی کھڑا تھا۔ اندھیرے میں جوگندر سنگھ کو ایسا معلوم ہوا کہ ترپاٹھی کی داڑھی اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ زمین کو چھو رہی ہے اُسکو پھر ترپاٹھی کی آواز سنائی دی "تم جلدی آگئے .... چلو یہ بھی اچھا ہوا .... میں نے ابھی ابھی ایک افسانہ مکمل کیا ہے — آؤ سنو۔"

نیا سال

کیلنڈر کا آخری پتّا جس پر موٹے حروف میں ۳۱، دسمبر چھپا ہوا تھا، ایک لمحہ کے اندر اس کی پتلی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ اب کیلنڈر ایک ٹنڈ منڈ درخت سا نظر آنے لگا جیسکی ٹہنیوں سے سارے پتّے خزاں کی پھونکوں نے اڑا دیئے ہوں

دیوار پر آویزاں کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کیلنڈر کا آخری پتا جو ڈیڑھ اینچ مربع کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا اس کی پتلی انگلیوں میں یوں کانپ رہا تھا گویا سزائے موت کا قیدی پھانسی کے تختہ پر سامنے کھڑا ہے۔

کلاک نے بارہ بجائے، پہلی ضرب پر انگلیاں متحرک ہوئیں اور آخری ضرب پر کاغذ کا ایک ٹکڑا دو ننھی سی گولی بنا دیا گیا انگلیوں نے یہ کام بڑی بے رحمی سے کیا اور جس شخص کی یہ انگلیاں تھیں اور بھی زیادہ بے رحمی سے اُس گولی کو نگل گیا۔

اُس کے لبوں پر ایک تیزابی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے خالی کیلنڈر کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا اور کہا "میں تمہیں لایا گیا ہوں۔ بغیر چبائے نگل گیا ہوں"

اُس کے بعد ایک ایسے قہقہے کا شور بلند ہوا جس میں توپوں کی گونج دب گئی جو نئے سال کے آغاز پر کہیں دور داغی جا رہی تھیں"

جب تک ان توپوں کا شور جاری رہا، اُس کے سوکھے ہوئے حلق سے قہقہے آتشیں مادے کی طرح نکلتے رہے، وہ بے حد خوش تھا۔ بے حد خوش، یہی وجہ تھی کہ اُس پر دیوانگی کا عالم طاری تھا اس کی مسرت آخری درجہ پہنچی ہوئی تھی، وہ سارے کا سارا ہنس رہا تھا مگر اُس کی آنکھیں رو رہی تھیں اور جب اُس کی آنکھیں ہنستیں تو آپ اس کے سکڑے لبوں کو دیکھ کر یہی سمجھتے کہ اس کی روح کسی نہایت ہی سخت عذاب میں سے گذر رہی ہے۔"

بار بار وہ فقرہ بڑبڑ کرتا "میں عمتیں کھا گیا ہوں — بغیر چبائے نگل گیا ہوں ایک ایک کر کے تین سو چھیاسٹھ دنوں کو، لیپ دن سمیت!"

خالی کیلنڈر..... اُس کے اس عجیب و غریب دعوے کی تصدیق کر رہا تھا۔"

آج سے ٹھیک چار برس پہلے جب وہ اپنے کاندھوں پر مصیبتوں کا پہاڑ اٹھا کر اپنی روزی آپ کمانے کے لئے میدان میں نکلا تو کتنے آدمیوں نے اس کا مضحکہ اڑایا تھا۔ کتنے لوگ اُس کی ہمت پر زیر لب ہنستے تھے مگر اُس نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی تھی اور اسے اب بھی کسی کی کیا پروا تھی، اُس کو صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس، دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا تھا۔ اور اب بھی اس چیز پر پابند تھا وہ ان دنوں گدھوں کی سی مشقت کر رہا تھا، کتوں سے بڑھ کر ذلیل زندگی بسر کر رہا تھا مگر یہ چیزیں اُس کے راستے میں حائل نہ ہوتی تھیں۔"

کئی بار اُسے ہاتھ پھیلانا پڑا — اُس نے ہاتھ پھیلایا، لیکن ایک شان سے۔ وہ کہا کرتا تھا "یہ سب بھکاری جو سڑکوں پر جھولیاں پھیلائے اور کشکول بڑھائے پھرتے رہتے ہیں گولی مار کر اڑا دینے چاہئیں۔ بھیک لے کر یہ ذلیل کتے شکر گذار نظر آتے ہیں حالانکہ انہیں شکریہ گالیوں سے ادا کرنا چاہیے — جو بھیک مانگتے ہیں وہ اتنے لعنتی نہیں جتنے کہ یہ لوگ جو دیتے ہیں۔ دان پُن کے طور پر — جنت میں ایک ٹھنڈی کوٹھڑی بک کرنے والے سوداگر!

اسکو کئی مرتبہ روپے پیسے کی امداد حاصل کرنے کی خاطر شہر کے دھنوانوں کے پاس جانا پڑا۔ اُس نے ان دولت مندوں سے امداد حاصل کی۔ انکی کمزوریاں انہی کے پاس بیچ کر! — اور اُس نے یہ سودا کبھی، اناڑی دکاندار کی خاطر نہیں کیا۔

آپ شہر کی صحت کے محافظ مقرر کئے گئے ہیں لیکن درحقیقت آپ بیماریاں فراہم کرنے کے ٹھیکیدار ہیں۔ حکومت کی کتابوں میں آپ کے نام کے سامنے ہیلتھ آفیسر لکھا جاتا ہے۔ مگر میری کتاب میں آپ کا نام امراض فروشوں کی فہرست میں درج ہے — پرسوں مارکیٹ میں آپنے سنگتروں کے دو سو ٹوکرے پاس کر کے بھجوائے جو طبی اصول کے مطابق صحت عامہ کے لئے مضر تھے۔ دس روز پہلے آپ نے قریباً دو ہزار کیلوں پر اپنی آنکھیں بند کرلیں جن میں سے ہر ایک ہیضہ کی پڑیا تھی۔ اور آج آپنے اس بوسیدہ اور غلیظ عمارت کو بچا لیا جہاں بیماریاں پرورش پاتی ہیں اور ....

اُسے عام طور پر آگے کہنے کی ضرورت ہی پیش آئی تھی۔ اس لئے کہ اُس کا سودا بہت کم گفتگو ہی سے طے ہو جاتا تھا۔

ایک سستے اور بازاری قسم کے اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ جسکی اشاعت دو سو سے زیادہ نہ تھی — دراصل وہ اشاعت کا قائل ہی نہ تھا — وہ کہا کرتا تھا جو لوگ اخبار پڑھا کرتے ہیں۔ بے وقوف ہیں۔ اور جو لوگ اخبار پڑھ کر اُس میں لکھی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ سب سے بڑے بیوقوف ہیں۔ جن لوگوں کی زندگی ہنگامے سے پر ہو۔ اُن کو ان چھپے ہوئے چیتھڑوں سے کیا مطلب

وہ اخبار اس لئے نہیں نکالتا تھا کہ اُسے مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ یا وہ اخبار کے ذریعے سے شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نہیں بالکل نہیں — ایک دو گھنٹے کی مصروفیت کے سوا جو اُس کے اخبار کی اشاعت کے لئے ضروری تھا وہ اپنا بقایا وقت اُن خوابوں کی تعبیر دیکھنے میں گذارا

کرتا تھا جو ایک زمانہ سے اُس کے ذہن میں موجود تھے وہ اپنے لئے ایک ایسا مقام بنانا چاہتا تھا جہاں اُسے کوئی چھیڑ نہ سکے۔ جہاں وہ اطمینان حاصل کر سکے ۔ خواہ وہ دو سکینڈ ہی کا کیوں نہ ہو۔

جنگ کے میدان میں فتح برلب گور ہی نصیب ہو۔ مگر ہو ضرور ۔۔۔ اور اگر شکست ہو جائے، پلٹنا پڑے تو بھی کیا ہرج ہے ۔۔۔ شکست کھائیں گے لیکن فتح کی کوشش حاصل کرتے ہوئے ۔۔۔۔۔ موت اُن کی ہے جو موت سے ڈر کر جان دیں، اور جو زندہ رہنے کی کوشش میں موت سے لپٹ جائیں زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے ۔۔۔ کم از کم اپنے لئے!"

دُنیا اس کے خلاف تھی جو شخص بھی اُس سے ملتا تھا اس سے نفرت کرتا تھا ۔ وہ خوش تھا۔ نفرت میں محبت سے زیادہ تیزی ہوتی ہے ۔۔۔ اگر سب لوگ مجھ سے محبت کرنا شروع کر دیں تو میں اس پہیے کی مانند ہو جاؤں جس میں اندر باہر، اوپر نیچے سب جگہ تیل دیا گیا ہو ۔۔۔ میں بھی کبھی اس گاڑی کو آگے دھکیل سکوں گا ۔۔۔ جسے لوگ زندگی کہتے ہیں۔

قریب قریب سب اُس کے خلاف تھے اور وہ اپنے مخالفین کی طرف یوں دیکھا کرتا تھا گویا وہ موٹر کے انجن میں لگے ہوئے پرزوں کو دیکھ رہا ہے "یہ کبھی ٹھنڈے نہیں ہونے چاہئیں"

اور اُس نے ابتک انکو ٹھنڈا نہ ہونے دیا تھا۔ وہ اس الاؤ کو جلائے رکھتا تھا۔ جس پر وہ ہاتھ ناپ کر اپنا کام کرتا تھا جس روز وہ اپنے مخالفین میں کسی کو نئے آدمی کا اضافہ کرتا، تو اپنے دل سے کہا کرتا تھا: "آج میں نے الاؤ میں ایک سوکھی لکڑی جھونک دی ہے جو دیر تک جلتی رہے گی"

اُس کے ایک مخالف نے جلسے میں اُس کے خلاف زہر بہت اگلا۔ اس کو بہت بُرا بھلا کہا۔ حتیٰ کہ اسے ننگی گالیاں بھی دیں اُسکے مخالف کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ سُنکر اُسے نیند نہ آئے گی مگر اس کے برعکس وہ تو اُس روز

معمول کیخلاف بہت آرام سے سویا۔ اور اُسے خود ساری رات آنکھوں میں کاٹنا پڑی۔ شب بھر اُس کا ضمیر اُسے ستاتا رہا۔ حتیٰ کہ صبح اُٹھ کر وہ اُس کے پاس آیا اور بہت بڑے ندامت بھرے لہجہ میں اُس سے معذرت طلب کی۔

"مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ جیسے بلند اخلاق انسان کو بُرا بھلا کہا۔ گالیاں دیں۔۔۔۔۔۔۔ در اصل۔۔۔۔۔۔۔ در اصل میں نے یہ سب کچھ بہت جلد بازی میں کیا۔ سوچے سمجھے بغیر۔۔۔۔۔ مجھے اُکسایا گیا تھا۔ میں اپنے کئے پر نادم ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرما دیں گے مجھ سے سخت غلطی ہوئی!"

بلند اخلاق! ـــ اُسے اس لفظ اخلاق سے بہت چڑ تھی۔ ـ اخلاق ـــ رُخِ انسانیت کا غازہ ـــ اخلاق ـــ اخلاق اخلاق۔۔۔۔ یعنی چہ؟ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو کی بے معنی گردان۔ انسان کی آزادانہ سرگرمیوں پر بیٹھا ہوا سینسر!

اُسکو معلوم تھا کہ اُس کے کمزور دل مخالف نے جھوٹ بولا۔ مگر نہ معلوم اُس کے دل میں غصہ پیدا نہ ہوا ـــ بخلاف اس کے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جو شخص اُسکے سامنے بیٹھا معافی مانگ رہا ہے اُسکی کوئی نہایت ہی عزیز شے فنا ہو گئی ہے۔ وہ نہایت درجہ بے رحم تصور کیا جاتا تھا، اور اصل میں تھا بھی بے رحم، نرم و نازک جذبات سے اُس کا سینہ بالکل پاک تھا مگر اس پتھر پر اُسے کوئی چیز رینگتی ہوئی نظر آئی۔ اُسے اس شخص پر رحم آنے لگا۔

"آج تم روحانی طور پر مر گئے ہو ـــ اور مجھے تمہاری اس موت پر افسوس ہے!"

یہ سُنکر اُس کے مخالف کو پھر گالیاں دینا پڑیں۔ مگر اُس کے کانوں تک کوئی آواز نہ پہنچ سکی۔ مدت ہوئی وہ اسکو کسی دور دراز قبرستان میں دفن کر چکا تھا۔

چار برس سے وہ اسی طرح جی رہا تھا، زبردستی، دنیا کی مرضی کے خلاف۔ بہت سی قوتیں پسپا کر دینے پر تلی رہتی تھیں۔ مگر وہ اپنے وجود کا ایک ذرہ بھی جنگ کے بغیر اُن کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ جنگ ۔ جنگ ۔ جنگ ـــ ہر مخالف قوت کے خلاف جنگ۔ رحم و ترحم سے ناآشنائی، عشق و محبت سے پرہیز

امید و خوف اور استقبال سے بیگانگی ــــــ اور پھر جو ہو سو ہو!

چار برس سے وہ زمانے کی تیز و تند ہواؤں میں ایک تناور اور مضبوط، درخت کی طرح کھڑا تھا۔ موسموں کے تغیر و تبدل نے ممکن ہے اُس کے جسم پر اثر کیا ہو۔ مگر اُس کی روح پر ابھی تک کوئی چیز اثر انداز نہ ہوئی تھی وہ ابھی تک ویسی ہی تھی ــــــ جیسی کہ آج سے چار برس پہلے تھی، فولاد کی طرح سخت۔ یہ سختی قدرت کی طرف سے عطا کی گئی تھی بلکہ خود اُسنے پیدا کی تھی۔

"وہ کہتا تھا نرم و نازک رُوح کو اپنے سینے میں دبا کر تم زمانے کی پتھریلی زمین پر نہیں چل سکو گے۔ یہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنا چاہیے اُسے پاگل خانے میں بند کر دینا چاہیے ــــــ"

شاعرانہ خیالات کو اُس نے اپنے دماغ میں کبھی داخل نہ ہونے دیا تھا اور اگر کبھی کبھار غیر ارادی طور پر اُس کے دماغ میں پیدا ہو جاتے تھے تو وہ ان حرامی بچوں کا فوراً گلا گھونٹ دیا کرتا تھا وہ کہا کرتا تھا، "میں اُن بچوں کا باپ نہیں بننا چاہتا جو میرے کاندھوں کا بوجھ بن جائیں۔"

اُس نے اپنے سازِ حیات سے ساری طربیں اتار دی تھیں اُس نے اس میں سے وہ تمام تار نوچ کر باہر نکال دیئے تھے جن میں سے نرم و نازک سُر نکلتے تھے۔

"زندگی کا صرف ایک راز ہے اور وہ رجز ہے۔ جو آگے بڑھنے، حملہ کرنے، مرنے اور مار دینے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اُس کے سوا باقی تمام راگنیاں فضول ہیں جو اعضا پر تھکاوٹ طاری کرتی ہیں۔"

اُس کا دل شباب کے باوجود عشق و محبت سے خالی تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے سے ہزار ہا خوبصورت لڑکیاں اور عورتیں گذر چکی تھیں مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اُس کے دل پر اثر نہ کیا تھا ــــ وہ کہا کرتا

تھا- اس پتھر میں عشق کی جونک نہیں لگ سکتی ا،،

وہ اکیلا تھا، بالکل اکیلا ـــــ کھجور کے اُس درخت کی مانند جو کسی تپتے ریگستان میں کھڑا ہو ـــــ مگر وہ اس تنہائی سے نہ گھبرایا تھا- دراصل وہ کبھی تنہا رہتا ہی نہ تھا-

"جب میں کام میں مشغول ہوتا ہوں تو وہی میرا ساتھی ہوتا ہے- اور جب میں اس سے فارغ ہو جاتا ہوں تو میرے خیالات وافکار میرے گرد وپیش جمع ہو جاتے ہیں ـــــ میں ہمیشہ اپنے دوستوں کے جمگھٹے میں رہتا ہوں"

وہ اپنے دن یوں بسر کر رہا تھا جیسے آم کھا رہا ہے. شام کو جب وہ بستر پر دراز تھا تو ایسا محسوس کرتا تھا کہ اُس نے دن کو چوسی ہوئی گٹھلی کے مانند پھینک دیا ہے- اگر آپ اُس کے کمرے کی ایک دیوار ہوتے تو کئی بار آپ کے ساتھ یہ الفاظ ٹکراتے جو کبھی کبھی سوتے وقت اُسکی زبان سے نکلا کرتے تھے آج کا دن کتنا کھٹا تھا- اس برس کے ٹوکرے میں اگر بقایا دن بھی اسی قسم کے ہوئے تو مزا آجائیگا!،،

اور راتیں ـــ- خواہ تاریک ہوں یا منور- اسکی نظر میں داستانیں تھیں؟ جن کو وہ روز طلوع آفتاب کے ساتھ ہی بھول جاتا تھا-

چار برس سے وہ اسی طرح زندگی بسر کر رہا تھا- ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھا ہے- ہاتھ میں ہتھوڑا لئے- زمانہ کا آہنی فیتہ اُسکے سامنے سے گذر رہا ہے اور وہ اس ہتھوڑے کی ضربوں سے اپنا ٹھپہ لگائے جا رہا ہے- ایک دن جب گذر نے لگتا ہے تو وہ فیتے کو تھوڑی دیر کے لئے تھام لیتا ہے اور پھر اُسے چھوڑ کر کہتا ہے" اب جاؤ- میں تمہیں استعمال کر چکا ہوں"

بعض لوگوں کو افسوس ہوا کرتا ہے کہ ہم نے فلاں کام فلاں وقت پر کیوں نہیں کیا- اور یہ پچھتاوا وہ دیر تک محسوس کیا کرتے ہیں. مگر اُسے آجتک اس

قسم کا افسوس یا رنج نہیں ہوا...... جو وقت سوچنے میں ضائع ہوتا ہے وہ اُس سے بغیر سوچے سمجھے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔ خواہ انجام کار اُسے نقصان ہی کیوں نہ ہو پہنچے۔ اگر سوچ سمجھ کر چلنے ہی میں فائدہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نیکو کار.... کی زندگی تکلیفوں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی ہرگز نہ ہوتی، جو ہر کام بڑے غور و فکر سے کیا کرتے تھے۔ اگر سوچ بچار کے بعد بھی نقصان ہو۔ یا ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ غور و فکر میں پڑنے کے بغیر ہی نتائج کا سامنا کر لیا جائے۔

اُسے ان چار برسوں میں ہزارہا ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا صرف منہ ہی نہیں بلکہ انکو سر سے پیر تک دیکھنا پڑا تھا مگر وہ اپنے اصول پر اسی طرح قائم تھا جس طرح تند لہروں میں ٹھوس چٹان کھڑی رہتی ہے

آج رات بارہ بجے کے بعد نیا سال اُسکے سامنے میں آ رہا تھا۔ اور پرانے سال کو ہضم کر گیا تھا بغیر ڈکار لیے۔

نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے مدِ مقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔ اسی طرح وہ نئے سال کے مقابلے میں اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا "میں تم جیسے پہلوانوں کو پچھاڑ چکا ہوں۔ اب تمہیں بھی چاروں شانے چت گرا دونگا"۔

جی بھر کر خوشی منانے کے بعد وہ نئے کیلنڈر کی طرف بڑھا جو میلی دیوار پر اُوپر کی طرف سمٹ رہا تھا۔ تاریخ نما سے اُس نے اُوپر کا کاغذ ایک جھٹکے سے علیحدہ کر دیا اور کہا "ذرا نقاب ہٹاؤ تو۔ دیکھو تمہاری شکل کیسی ہے.... میں ہوں تمہارا آقا۔ تمہارا مالک۔ تمہارا سب کچھ!" یکم جنوری "کل رات تم فنا کر دیئے جاؤ گے!"

چوہیاں

شوکت کو چوہے پکڑنے میں بہت مہارت حاصل ہے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا ہے یہ ایک فن ہے جس کو باقاعدہ سیکھنا پڑتا ہے اور سچ پوچھیے تو جو ترکیبیں شوکت کو چوہے پکڑنے کے لیے یاد ہیں، اُنھیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کافی محنت کی ہے۔ اور اگر چوہے پکڑنے کا کوئی فن نہیں ہے تو اُس نے اپنی ذہانت سے اُسے فن بنا دیا ہے۔ اُس کو آپ کوئی چوہا دکھا دیجیے، وہ فوراً آپ کو بتائے گا کہ اس ترکیب سے وہ اتنے گھنٹوں میں پکڑا جائے اور اس طریقے سے اگر آپ اُسے پکڑنے کی کوشش کریں تو اتنے دن لگ جائیں گے۔

چوہوں کی نسلوں اور اُن کی مختلف عادات و اطوار کا شوکت بہت گہرا مطالعہ کر چکا ہے۔ اُس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کس ذات کے چوہے جلدی پھنس جاتے ہیں اور کس نسل کے چوہے بڑی مشکل کے بعد قابو میں آتے ہیں۔ اور پھر ہر قسم کے چوہوں کو پھانسنے کی ایک سو ایک ترکیب شوکت کو معلوم ہے۔

موٹے موٹے اصول اُس نے ایک روز مجھے بتائے تھے۔ کہ چھوٹی چھوٹی چوہیاں اگر پکڑنی چاہو تو ہمیشہ نیا چوہے دان استعمال کرنا،

چاہیئے ۔ چوہے دان کی ساخت کسی قسم کی بھی ہو، اسکی کوئی پرواہ نہیں۔ خیال اس بات کا رکھنا چاہیئے کہ چوہے دان ایسی جگہ پر نہ رکھا جائے جہاں آپ نے چوہے یا چوہیاں دیکھی نہیں ۔ ٹرنکوں کے پیچھے ، الماریوں کے نیچے جہاں کہیں بھی آپ نے چوہیاں نہ دیکھی ہوں ۔ چوہے دان رکھ دیا جائے اور اس میں تلی ہوئی مچھلی کا چھوٹا سا ٹکڑا رکھ دیا جائے ۔ ٹکڑا بڑا نہ ہو ۔ اگر چوہے دان کھٹ سے بند ہونے والا ہے تو اُس میں خاص طور پر بڑا ٹکڑا نہیں لگانا چاہیئے کہ چوہیا اندر آ کر اُس ٹکڑے کا کچھ حصہ کُتر کر باہر چلی جائے گی ۔ ٹکڑا چھوٹا ہوگا تو اُسے اتارنے کی کوشش کرے گی اور یوں جھٹ پٹ پنجرے میں قید ہو جائے گی ۔ ایک چوہیا پکڑ لینے کے بعد چوہے دان کو گرم پانی سے دُھو لینا چاہیئے ۔ اگر آپ اسے اچھی طرح نہ دھوئیں گے تو پہلی چوہیا کی بو اسمیں رہ جائے گی جو دوسری چوہیوں کے لئے خطرے کے الارم کا کام دے گی ۔ اس لئے اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے ۔ ہر چوہے یا چوہیا کو پکڑنے کے بعد چوہے دان کو دھو لینا چاہیئے اگر گھر میں زیادہ چوہے چوہیاں ہوں اور اُن سب کو پکڑنا ہو تو ایک چوہے دان کام نہیں دے گا تین چار چوہے دان پاس رکھنا چاہئیں جو بدل بدل کر کام میں لائے جائیں چوہے کی ذات بڑی سیانی ہوتی ہے اگر ایک ہی چوہے دان گھر میں رکھا جائیگا تو چوہے اُس سے خوف کھانا شروع کر دیں گے اور اُس کے نزدیک تک نہیں آئیں گے ۔ بعض اوقات ان تمام باتوں کا خیال رکھنے پر بھی چوہے چوہیاں قابو میں نہیں آتیں ۔ اس کی بہت سی وجہیں ہوتی ہیں بہت ممکن ہے کہ آپ سے پہلے جو مکان میں رہتا تھا اُس نے اسی قسم کا چوہے دان استعمال ہو جیسا کہ آپ کر رہے ہیں ، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے چوہے پکڑ کر باہر گلی یا بازار میں چھوڑ دیا ہو اور وہ چند دنوں کے بعد واپس گھر آ گیا ہو ۔ ایسے چوہے جو ایکبار چوہے دان میں پھنسکر پھر اپنی جگہ پر واپس آ جائیں اس قدر ہوشیار ہو جاتے ہیں کہ بڑی مشکل سے قابو میں آتے ہیں یہ چوہے دوسرے چوہوں کو خبردار کر دیتے ہیں ۔

جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کی تمام کوشش بے سود ثابت ہوتی ہیں اور چوہے بڑے اطمینان سے اِدھر اُدھر دوڑتے رہتے ہیں اور آپ کا اور آپ کے چوہے دان کا منہ چڑاتے ہیں — چوہے کے بل کے پاس تو چوہے دان ہرگز نہیں رکھنا چاہیئے اس لیئے کہ اتنی بڑی چیز اپنے گھر کے پاس دیکھ کر جو پہلے کبھی نہیں ہوتی تھی چوہا فوراً چوکنا ہو جاتا ہے اور اس کو دال میں کالا کالا نظر آ جاتا ہے۔ جب کسی محلے سے چوہے نہ پکڑے جائیں تو گرد و پیش کی فضا کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ اس پاس کے لوگ کیسے ہیں، کس قسم کی چیزیں کھاتے ہیں۔ اور ان کے گھروں کے چوہے کس چیز پر جلد گرتے ہیں یہ تمام باتیں معلوم کر کے آپ کو تجربے کرنا پڑینگے اور ایسی چیز یا ترکیب ڈھونڈنا پڑیگی جس کے ذریعے سے آپ اپنے گھر کے چوہے گرفتار کر سکیں۔

شوکت چوہے کے فن پر ایک طویل لکچر دے سکتا ہے۔ کتاب لکھ سکتا ہے مگر چونکہ وہ طبعاً خاموش پسند ہے اس لیئے اس کے متعلق زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔ صرف مجھے معلوم ہے کہ وہ اس فن میں کافی مہارت رکھتا ہے، محلے کے دوسرے آدمیوں کو اسکی مطلق خبر نہیں، البتہ اُس کے پڑوسی اُسکے یہاں سے کبھی کبھی چوہے دان عاریتاً ضرور منگایا کرتے ہیں اور اس نے اس غرض کے لیئے ایک پرانا چوہیدان مخصوص کر رکھا ہے۔

پچھلی برسات کی بات ہے۔ میں شوکت کے یہاں بیٹھا تھا کہ اُس کے پڑوسی خواجہ احمد صادق صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا بڑا لڑکا ارشد صادق آیا میں نے جب۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو اس نے کہنا شروع کیا: "ان کم بخت چوہوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ابا جی سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ زہر منگوائیے ان کے مارنے کے لیئے مگر ان کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی اور یہاں ہر روز میری کتابوں کا ستیاناس ہو رہا ہے — آج الماری کھولی تو یہ بڑا چوہا میرے سر پر آن گرا۔ تمہیں کیا بتاؤں ان چوہوں نے مجھے کتنا تنگ کیا ہے۔ کسی کتاب کی جلد

سلامت نہیں۔ بعض بڑی کتابوں کی جلد تو اس درصفائی سے ان کم بختوں نے کتری ہے کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے آری سے کاٹ دی ہے۔"

میں ارشد کو شوکت کے پاس لے گیا اور کہا۔ ارشد صاحب تشریف لائے ہیں۔ چوہوں کی شکایت لے کر آئے ہیں!

ارشد کرسی پر بیٹھ گیا اور پیشانی پر سے پسینہ پونچھ کر کہنے لگا۔ شوکت صاحب، میں کیا عرض کروں۔ ابھی الماری کی تمام کتابیں باہر نکال کر آیا ہوں۔ ایک بھی تو ان میں ایسی نہیں رہی۔ جس پر چوہوں نے اپنے دانت تیز نہ کیے ہوں یا پنجے موجود ہے، دوسری الماریاں ہیں جن میں ہر وقت کھانے پینے کی چیزیں پڑی رہتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میری کتابیں کترنے میں انکو کیا مزا آتا ہے۔ یعنی کاغذ اور دفتی بھلا کوئی کھانے کی چیز ہے۔ اجی صاحب انبار کترے ہوئے گتے اور چھلکے ہوئے کاغذوں کا میں نے الماری میں سے نکالا ہے۔"

شوکت مسکرایا، "ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے گھر میں چوہے ہر روز سیندھ لگاتے پھریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

ارشد نے اس مذاق سے لطف نہ اٹھایا اس لیے کہ وہ واقعی بہت پریشان تھا: "شوکت صاحب، وہ معمولی چوہے تھوڑے ہیں۔ موٹے موٹے سنڈے ہیں جو کھلے بندوں پھرتے ہیں۔ میرے سر پہ ایک آن پڑا۔ خدا کی قسم ابھی تک درد ہو رہا ہے۔"

شوکت اور میں دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ارشد بھی مسکرا دیا: "آپ تو دل لگی کر رہے ہیں اور یہاں غصہ کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔"

شوکت نے اٹھ کر ارشد کو سگرٹ پیش کیا: "اپنے دل کا غبار اس کے دھوئیں کیساتھ باہر نکالیے اور مجھے بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

ارشد نے سگرٹ سلگایا اور کہا: "میں آپ سے چوہے دان مانگنے آیا تھا۔ امی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ شوکت کے گھر میں دو تین پڑے

دیکھے ہیں۔"

شوکت نے فوراً نوکر کو آواز دی اور اُس سے کہا "وہ چوہے دان جو تم نے کل گرم پانی سے دھوکر خوب صاف کیا تھا۔ ارشد صاحب کے گھر دے آؤ اور دیکھو اُن کے نوکر سے کہنا کہ اُس الماری کے نیچے، اُس کمرے میں رکھے جہاں ارشد صاحب اپنی کتابیں رکھتے ہیں ـــ اُس الماری سے دور نہیں۔ بھئی، اس میں مچھلی یا تیل میں تلی ہوئی کسی چیز کا ٹکڑا لگا کر رکھ دیا جائے" پھر ارشد صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "آپ بھی اچھی طرح سن لیجیے گا بازار سے اگر پکوڑے مل جائیں تو ایک پکوڑا کافی رہے گا ـــ اور جب چوہا پکڑا جائے تو خدا کے لیے اُسے میرے گھر کے پاس نہ چھوڑ دیجیے گا اور بہت جگہیں آپ کو مل جائیں گی جہاں سے وہ پھر واپس نہ آسکے۔"

دیر تک ارشد ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ شوکت اُس کو مزید ہدایات دیتا رہا۔ جب نوکر چوہے دان اُس کے گھر پہونچا کر واپس آگیا تو اُس نے اجازت چاہی اور چلا گیا۔

اس واقعہ کے چار روز بعد ارشد میرے گھر آیا۔ میں اور وہ چونکہ اکھٹے کالج میں پڑھتے رہے ہیں اس لیے وہ میرے بے تکلف دوست ہیں۔ شوکت سے اس کا تعارف میں نے ہی کرایا تھا۔ آتے ہی اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے مجھ سے کوئی راز کی بات تخلیہ میں کرنا چاہتا ہے۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"میں تمہیں ایک بڑی دلچسپ بات سنانے آیا ہوں مگر یہاں نہیں سناؤنگا تم باہر چلو۔" یہ کہہ کر اُس نے مجھے بازو سے پکڑا اور باہر لے گیا۔

راستے میں اُس نے مجھے اپنی داستان سنانا شروع کی "عجیب و غریب کہانی ہے جو میں تمہیں سنانے والا ہوں۔ خدا ایسی بات ہوئی ہے کہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی ـــ یعنی کسے یقین تھا کہ اتنی ضدی اور نفاست پسند لڑکی ایک چوہے دان کے ذریعے سے میری قابو میں آجائے گی ـــ اُسی چوہے دان کے ذریعہ

سے جو اُس روز تمہارے سامنے میں نے شوکت سے لیا تھا۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا: "کون سی لڑکی اُس چوہے دان میں پھنس گئی — لڑکی نہ ہوئی چوہیا ہو گئی — آخر بتاؤ تو سہی لڑکی کون ہے"۔

"ہاں وہی سلیمہ جس کی نفاست پسندیوں کی بڑی دھوم ہے اور جس کی ضدی طبیعت کے بڑے چرچے ہیں"۔

میری حیرت اور زیادہ بڑھ گئی "سلیمہ — جھوٹ"۔

"خدا کی قسم — جھوٹ بولنے والے پر لعنت۔ اور بھلا میں تم سے جھوٹ کیوں کہنے لگا۔ یہی سلیمہ، شوکت کے دئے ہوئے چوہے دان کے ذریعہ سے میرے قابو میں آ گئی اور بخدا یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ آسانی سے پھنس جائے گی"۔

میں نے پھر اُسی حیرت بھرے لہجہ میں کہا "لیکن یہ ہوا کیوں کر تم مجھے پوری یہ داستان سناؤ تو کچھ پتہ چلے — چوہے دانوں سے بھی کبھی کسی نے لڑکیاں پھانسی ہیں۔ بڑی بے تکی سی بات معلوم ہوتی ہے مجھے"۔

میں سلیمہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہمارے یہاں اُس کا اکثر آنا جانا ہے وہ صرف نفاست پسند ہی نہیں بلکہ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ انگریزی زبان پر اُسے خوب عبور حاصل ہے۔ تین چار مرتبہ اُس سے مجھے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تو میں نے معلوم کیا ادب و شعر کے متعلق اس کی معلومات وسیع ہیں۔ مصوری بھی ہے پیانو بجانے میں بڑی مہارت رکھتی ہے اُس کی ضدی اور نفاست پسند طبیعت کے بارے میں بھی۔ چونکہ مجھے بہت کچھ معلوم ہے اسی لئے مجھے ارشد کی یہ بات سن کر سخت تعجب ہوا۔ وہ تو کسی کو خاطر ہی میں لانے والی نہیں۔ ارشد جیسے چغد کو اُس نے کیسے پسند کر لیا۔ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا

ارشد بے حد خوش تھا۔ اُس نے میری طرف فخریہ نظروں سے دیکھا اور کہا: "میں تمہیں سارا واقعہ سنا دیتا ہوں۔ اِس کے بعد کسی قسم کی وضاحت

کی ضرورت نہ رہے گی۔ قصہ یہ ہے کہ پرسوں رات کو امی جان اور ابا جی اور دوسرے لوگ سب سینما دیکھنے چلے گئے ہیں گھر میں اکیلا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا یہی سوچ رہا تھا۔ ایک موٹا سا چوہا مجھے نظر آیا۔ اُس کو دیکھنا تھا کہ مارے غصہ کے میرا خون کھولنے لگا فوراً اٹھا اور اُس کو پکڑنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اُسے ہاتھ سے پکڑنا تو ظاہر ہے بالکل محال تھا۔ میں کسی طریقے سے اُس کو مار بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ کمرے میں بیشمار فرنیچر اور ٹرنک وغیرہ پڑے تھے۔ میں نے شوکت کے دیئے ہوئے چوہے دان کا خیال کیا جس سے آٹھ چوہے ہم لوگ پکڑ چکے تھے مگر شوکت کی ہدایات کے مطابق اس کو گرم پانی سے دھونا ضروری تھا مجھے کوئی کام تو تھا نہیں اور وقت بھی کافی تھا۔ چنانچہ میں نے خود ہی سماوار میں پانی گرم کیا اور چوہے دان کو دھونا شروع کر دیا۔ ابھی میں نے لوٹے سے گرم پانی کا دھار اُس کے آہنی تاروں پر ڈالی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سلیمہ کھڑی ہے۔ میں نے کہا: "آئیے، آئیے۔" وہ اندر چلی آئی اور کہنے لگی: "کیا کر رہے ہیں آپ؟" میں نے جھینپ کر جواب دیا: "چوہے دان دھو رہا ہوں۔" وہ بے اختیار ہنس پڑی: "چوہے دان دھو رہے ہیں ـــ یہ صفائی آخر کس لیئے ہو رہی ہے کوئی بڑا چوہا انسپکشن کے لیئے تو نہیں آ رہا؟" یہ سنکر میری جھینپ دور ہو گئی اور میں نے قہقہہ لگا کر کہا: "جی ہاں ـــ ایک بہت بڑا چوہا انسپکشن کے لیئے آنا چاہتا ہے یہ صفائی اسی سلسلے میں ہو رہی ہے۔"

یہ کہہ کر ارشد خاموش ہو گیا۔ اس پر میں نے اس سے کہا: "سناتے جاؤ رکو نہیں۔ تمہاری داستان بہت دلچسپ ہے ـــ ہاں تو پھر سلیمہ نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ میری بات سُن کر وہ صحن ہی میں چوکی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی: "آپ صفائی کیجئے۔ اس صفائی کی انسپکشن میں کروں گی ـــ ہاں یہ تو بتایئے آج یہ سب لوگ کہاں گئے ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "سینما گئے ہیں۔ میں بیکار

بیٹھا تھا کہ ایک چوہا اپنے کمرے میں مجھے نظر آیا۔ کیا عرض کروں ہمارے گھر میں بڑے بڑے موٹے سنڈے چوہے سینہ مارتے پھرتے ہیں میری کتابوں کا تو انہوں نے ستیاناس کر دیا ہے۔ اب اُن کے ظلم و ستم سے میرے اندر ایک انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا ہے یہ چوہے دان لے آیا ہوں اس سے ہر روز دو تین چوہے پکڑتا ہوں اور اُن کو کالے پانی بھیجتا ہوں۔" سلیمہ نے میری گفتگو میں دلچسپی ظاہر کی۔ "خوب، خوب۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ کالا پانی یہاں سے کتنی دور ہے۔" میں نے کہا: "بہت دور نہیں۔ کوتوالی کے پاس ہی جو گندہ نالا بہتا ہے اُسی کو فی الحال میں نے کالا پانی بنا لیا ہے چوہوں نے اس پر اعتراض نہیں کیا، کیونکہ اُس موری کا پانی کالا ہی ہے۔" ہم دونوں خوب ہنسے۔ پھر میں نے لوٹا اٹھایا اور چوہے دان کو برش کے ساتھ دھونا شروع کر دیا۔ جب چھینٹے اڑے تو میں نے سلیمہ سے کہا "آپ یہاں سے اُٹھ جائیے چھینٹے اڑ رہے ہیں ـــ ویسے بھی میری بڑی بدتمیزی ہے کہ میں آپ کے سامنے ایک ایسی غلیظ چیز صاف کرنے بیٹھ گیا ہوں۔" اُس نے فوراً ہی کہا "آپ تکلف نہ کیجیے اور اپنا کام کرتے چلے جائیے چھینٹوں کے متعلق بھی آپ کوئی فکر نہ کریں۔" جب میں نے چوہے دان اچھی طرح دھو کر صاف کر لیا تو سلیمہ نے پوچھا "اچھا آپ اب یہ بتائیے کہ اس کو دھونے کی کیا ضرورت تھی، بغیر دھوئے کیا آپ اس ظالم چوہے کو نہیں پکڑ سکتے۔" میں نے کہا "جی نہیں ـــ اس سے پہلے چونکہ اس چوہے دان میں ہم ایک چوہا پکڑ چکے ہیں اور اُس کی بو ابھی تک اس میں باقی ہے اس لیے دُھونا ضروری ہے گرم پانی سے پہلے چوہے کی بُو غائب ہو جائے گی اس لیے دوسرا چوہا آسانی کے ساتھ پھنس جائے گا" میری یہ بات سُن کر سلیمہ نے بالکل بچوں کی طرح کہا "اگر چوہے دان میں چوہے کی بو رہ جائیگی۔ تو دوسرا چوہا نہیں آتا" میں نے اسکول ماسٹروں کا انداز اختیار کر لیا "بالکل نہیں اس لیے کہ چوہوں کی ناک بڑی تیز ہوتی ہے۔ آپ نے سنا نہیں عام طور پر

یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی کی تو چوہے کی ناک ہے یعنی اُس کی قوتِ شامہ بڑی تیز ہے۔ سمجھیں آپ؟" سلیمہ نے میری طرف جب دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے ایک بہت بڑی بات اُس سے کہہ دی ہے جس کو سُن کر وہ بہت مرعوب ہوگئی ہے۔ اُس کی نگاہوں میں مجھے اپنے متعلق قدر و منزلت کی جھلک نظر آئی اس سے مجھے شہ مل گئی۔ چنانچہ وہ تمام باتیں جو میں نے شوکت سے اُس روز سنی تھیں، ایک لکچر کی صورت میں دُہرانا شروع کر دیں اور وہ"

میں نے اُسکی بات کاٹ کر کہا: "یہ سب مجھے افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ تم جھوٹ کہتے ہو!"

"تم بھی عجیب قسم کی منکر ہو" راشد نے بگڑ کر کہا: "بھئی قسم خدا کی، اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے تمہیں حیرت تو ضرور ہوگی، اس لئے کہ میں خود متحیر ہوں۔ سلیمہ جیسی پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی ایسی فضول باتوں سے متاثر ہوگئی یہ بات مجھے ہمیشہ متحیر رکھے گی۔ مگر کبھی حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا اُس نے میری اوٹ پٹانگ باتیں بڑے غور سے سنیں، جیسے میں اُس سے دنیا کا رازِ نہفتہ بتا رہا ہوں — واللہ یہ ذہین لڑکیاں بھی پرلے درجے کی سادہ لوح ہوتی ہیں — سادہ لوح نہیں کہنا چاہئے خدا معلوم کیا ہوتی ہیں تم اُنسے کوئی بات کہو تو بس بگڑ جائیں گی۔ یہ سمجھیں گی کہ ہم نے اُن کی عقل و دانش پر حملہ کر دیا ہے اور جب اُن سے کوئی معمولی سی بات کہو جس سے ذہانت کا دُور کا تعلق بھی نہ ہو تو وہ یہ سمجھیں گی کہ اُن کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تم کسی فلسفہ داں اور بال کی کھال اتارنے والی عورت سے کہو کہ خدا ایک ہے تو وہ نکتہ چینی شروع کر دیگی اگر اُس سے کہو دیکھو میں نے تمہارے سامنے ماچس کی ڈبیہ سے ایک تیلی نکالی ہے۔ یہ ہوئی ایک تیلی، اب میں دوسری نکالتا ہوں میز پہ ان تیلیوں کو پاس رکھ کر جب تم اُس سے یہ کہو گے۔ دیکھو اب یہ دو تیلیاں ہوگئی ہیں تو وہ

اس قدر خوش ہو گی کہ اُٹھ کر مجھے چومنا شروع کر دیگی۔"

یہ کہہ کر ارشد خوب ہنسا۔ مجھے بھی ہنسنا پڑا اس لئے کہ بات ہی ہنسی پیدا کرنے والی تھی۔ جب ہم دونوں کی ہنسی کم ہوئی میں نے اُس سے کہا "اب تم اپنی بقایا کہانی سناؤ اور ہنسی مذاق چھوڑ دو۔"

"ہنسی مذاق کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ بھائی" ارشد نے بڑی سنجیدگی سے کہا "میں تو اس سے ہنسی مذاق سے ہی باتیں کر رہا تھا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے سُن رہی تھی۔ ہاں تو جب میں نے اُسے چوہے پکڑنے کے اصول بتا دیئے تو اور زیادہ بچہ بن کر اُس نے مجھ سے کہا "ارشد صاحب آپ تو فوراً چوہے پکڑ لیتے ہونگے؟" میں نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا "جی ہاں کیوں نہیں۔" اس پر سلیمہ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا "کیا آپ اس چوہے کو جو آپ نے ابھی ابھی دیکھا تھا میرے سامنے پکڑ سکتے ہیں؟" ظاہر ہے کہ سلیمہ کا سوال بہت ہی مشکل تھا مگر میں نے فوراً ہی جواب دیا "اجی یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ یوں چٹکیوں میں اُسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔" سلیمہ اٹھ کھڑی ہوئی "تو چلئے میرے سامنے اُسے گرفتار کیجئے میں سمجھتی ہوں آپ کبھی اس چوہے کو پکڑ نہیں سکیں گے۔" میں یہ سنکر یوں ہی مسکرا دیا۔ "آپ غلط سمجھتی ہیں۔ پندرہ نہیں تو بیس منٹ میں وہ چوہا اس چوہے دانی میں ہوگا۔ اور آپ کی نظروں کے سامنے بشرطیکہ آپ اتنے عرصے تک انتظار کر سکیں۔" سلیمہ نے کہا۔ "میں ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ سے پھر کہتی ہوں کہ آپ ناکام رہیں گے۔ ۔۔۔ وقت مقرر کرکے آپ چوہے کو کیسے پکڑ سکتے ہیں؟ ۔۔۔ میں اُس وقت عجیب و غریب موڈ میں تھا۔ اگر کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ تم خدا دکھا سکتے ہو تو میں فوراً یہ کہتا، ہاں دکھا سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے بڑے فخریہ لہجے میں سلیمہ سے کہا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ۔۔۔ میں ابھی آپ کو وہ چوہا پکڑ کر دکھا دیتا ہوں مگر شرط باندھیے۔" اس نے کہا "میں ہر شرط باندھنے کے تیار ہوں، اس لیے کہ ہار آپ کی ہوگی۔" اس پر خدا معلوم

مجھ میں کہاں سے جرأت آگئی جو میں نے اُس سے کہا: "تو یہ وعدہ کیجئے کہ اگر میں نے چوہا پکڑ لیا تو آپ سے جو چیز میں طلب کروں گا آپ بخوشی دیدیں گی" سلیمہ نے جواب دیا: "مجھے منظور ہے" چنانچہ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چوہے دان میں صبح کی تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا لگایا اور اُس کو اپنی کتابوں کی الماری سے دور صوفے کے پاس رکھدیا۔ شرط ورط کا مجھے اسوقت کوئی خیال نہ تھا۔ لیکن میں دل میں یہ دعا ضرور مانگ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی چوہا ضرور پھنس جائے تاکہ میری سرخروئی ہو۔ نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت میں نے گپ ہانکدی۔ بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے گا، چنانچہ، ایکبار میرے جی میں آئی کہ اُس سے کہدوں، "میں تو آپ سے یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ چوہا پندرہ منٹ میں کیسے پکڑا جاتا ہے — گاندھی جی کا بتیہ گرہ ہی ہوتا تو اسے جب چاہتے پکڑ لیتے مگر یہ تو چوہا ہے آپ خود ہی غور فرمائیں۔ مگر میں اُس سے یہ کہہ نہ سکا اس لیئے کہ اس میں میری شکست تھی"

یہ کہہ کر ارشد نے جیب سے سگرٹ نکال کر سلگایا اور مجھ سے پوچھا "کیا خیال ہے تمہارا اس داستان کے متعلق؟"

میں نے کہا: "بہت دلچسپ ہے مگر اس کا دلچسپ ترین حصّہ تو ابھی باقی ہے۔ جلدی جلدی وہ بھی سنا دو"

"کیا پوچھتے ہو دوست — وہ پندرہ منٹ جیں نے انتظار میں، گذارے ساری عمر مجھے یاد رہیں گے، اور سلیمہ کمرے کے باہر باہر کرسیوں پر بیٹھی تھی وہ نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی مگر میری حالت تھی۔ سلیمہ نے میری جیب گھڑی اپنی ران پر رکھی ہوئی تھی میں بار بار جھک کر اُسوقت دیکھ رہا تھا دس منٹ گذر گئے، مگر پاس والے کمرہ میں جو چوہے دان بند ہونے کی کھٹ نہ سنائی دی۔ گیارہ منٹ گذر گئے کوئی آواز نہ آئی ساڑھے گیارہ منٹ ہو گئے خاموشی طاری رہی۔ بارہ منٹ گذرنے پر بھی کچھ نہ ہوا — سوا بارہ منٹ ہو گئے، ساڑھے

بلرہ ہوئے کہ دفعتاً، کھٹ کی آواز بلند ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چوہے دان
میرے سینے میں بند ہوا ہے کچھ لمحہ کے لئے میرے دل کی دھڑکن بند سی ہو گئی۔
لیکن فوراً ہی ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے دوڑ کر کمرے میں گئے اور چوہے دان
کے تاروں میں سے جب مجھے ایک موٹے چوہے کی تھوتھنی اور اُس کی لمبی
لمبی مونچھیں نظر آئیں تو میں خوشی سے اچھل پڑا پاس ہی سلیمہ کھڑی تھی۔ اس
کی طرف میں نے فتح مند نظروں سے دیکھا اور جھٹ پٹ اس کے حیرت سے
کھلے ہوئے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ سلیمہ چند
لمحات تک بالکل خاموش رہی، لیکن اِس کے بعد اُس نے خفگی آمیز لہجہ میں مجھ
سے کہا "یہ کیا بیہودگی ہے؟" اُس وقت خدا معلوم میں کس موڈ میں تھا کہ
ایک بار میں نے پھر اُسی افراتفری میں اس کا بوسہ لے لیا اور کہا "اجی مولانا
آپ نے شرط ہاری ہے" اور .... تیسری مرتبہ اُس نے اپنے ہونٹ
بوسے کے لئے خود پیش کر دیئے ــــ جس طرح چوہا ہاتھ آیا اُسی طرح
سلیمہ بھی ہاتھ آ گئی۔ مگر کبھی میں شوکت کا بہت ممنون ہوں اگر میں نے
چوہے دان کو گرم پانی سے نہ دھویا ہوتا تو چوہا کبھی نہ پھنستا۔"

یہ داستان سن کر مجھے بہت لطف آیا۔ لیکن افسوس بھی ہوا،
اس لئے کہ شوکت اس لڑکی سلیمہ کی محبت میں بری طرح گرفتار ہے۔

چوری؟

سکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور اُس بڈھے آدمی سے جو ٹاٹ پر بیٹھا، اپنے استخوانی ہاتھ تاپنے کی خاطر بڑھائے ہوئے تھا کہنے لگے "باباجی کوئی کہانی سنائیے؟.."

مردِ معمر نے جو تمانیا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اپنا بھاری سر اٹھایا جو گردن کی لاغری کی وجہ سے پیچھے کو جھکا ہوا تھا "کہانی - اب میں خود ایک کہانی ہوں مگر ——" اس کے بعد کے الفاظ اپنے پوپلے منہ ہی میں بڑبڑائے —— شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی کہ فلسفیانہ نکات حل کر سکتے۔ لکڑی کے ٹکڑے ایک شور کے ساتھ جل جل کر آتشیں شکم کو پُر کر رہے تھے۔ شعلوں کی رعنائی روشنی لڑکوں کے معصوم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ ننھی ننھی چنگاریاں سپید راکھ کی نقاب اُلٹ اُلٹ کر حیرت میں سر بلند شعلوں کا منہ تک رہی تھیں۔

بوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں لڑکوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا "کہانی —— ہر روز کہانی! —— کل سناؤں گا"

لڑکوں کے ٹمٹماتے ہوئے چہروں پر افسردگی چھا گئی - نا اُمیدی کے

عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے "آج رات کہانی سنے بغیر سونا ہوگا" یکایک اُن میں سے ایک لڑکا جو دوسروں کی بہ نسبت بہت ہوشیار تھا اور ذہین معلوم ہوتا تھا الاؤ کے قریب سرک کر بلند آواز میں بولا "مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا اور وعدہ خلافی کرنا درست نہیں ــ کیا آپ کو کل والے حامد کا انجام یاد نہیں ــ ہے جو ہمیشہ اپنا کہا بھول جایا کرتا تھا

"درست! ــ میں بھول گیا تھا" بوڑھے آدمی نے یہ کہہ کر اپنا سر جھکا لیا۔ جیسے وہ اپنی بھول پر نادم ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس دلیر لڑکے کی جرأت کا خیال کر کے مسکرایا "میرے بچے مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔ مگر میں کونسی کہانی سناؤں؟ ٹھہرو مجھے یاد کر لینے دو" یہ کہتے ہوئے سر جھکا کر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اُسے جن اور پریوں کی لایعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی وہ بچوں کو ایسی کہانیاں سنایا کرتا تھا جو اُن کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں۔ اُسے بہت سے فضول قصے یاد تھے جو اُس نے بچپن میں سنے تھے۔ یا کتابوں میں پڑھے تھے مگر اس وقت وہ اپنے بربطِ ہستی کے بوسیدہ تار چھیڑ رہا تھا کہ شاید ان میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اٹھے۔

لڑکے باباجی کو خاموش دیکھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ غالباً اُس لڑکے کی بابت جسے کتاب چرانے پر بید کی سزا ملی تھی۔ باتوں باتوں میں اُن میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا "ماسٹر جی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چرالی تھی ــ مگر اُسے سزا نہ ملی"

"کتاب چرالی تھی" ان چار لفظوں نے جو بلند آواز میں ادا کیے گئے تھے بوڑھے کی خفیہ یاد میں ایک واقعہ کو جگا دیا۔ اُس نے سیدھا سر اٹھایا۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے بھولی بسری داستان کو انگڑائیاں لیتے پایا۔ ایک لمحہ کے لیے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ مگر وہیں غرق ہو گئی ــ اضطراب کی حالت میں اُسے اپنے

نحیف جسم کو جنبش دے کر الاؤ کے قریب گیا۔ اس کے چہرے کے تغیر و تبدل صاف طور پر عیاں تھا کہ وہ کسی واقعے کو دوبارہ یاد کر کے بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے۔

الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔ دفعتاً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا۔" بچو! آج میں اپنی کہانی سناؤں گا۔

لڑکے فوراً اپنی باتیں چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ الاؤ کی چٹختی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر ابھر کر خاموش ہو گئیں ــــ ایک لمحہ کے لئے فضا پر مکمل سکوت طاری رہا۔

"بابا جی اپنی کہانی سنائیں گے"! ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا۔ سرک کر آگ کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"ہاں، اپنی کہانی"! یہ کہہ کر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہوئی گھنی بھووں میں سے کوٹھڑی کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکوں سے پھر مخاطب ہوا۔" میں آج تمہیں اپنی پہلی چوری کی داستان سناؤں گا"!

لڑکے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے انہیں اس بات کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ کہ بابا جی کسی زمانہ میں چوری بھی کرتے رہے ہیں ــــ بابا جی جو ہر وقت انہیں برے کاموں سے بچنے کے لئے نصیحت کیا کرتے ہیں۔

لڑکا جو ان سب میں دلیر تھا۔ اپنی حیرت نہ چھپا سکا" پر کیا آپ نے واقعی چوری کی ہے؟"

"واقعی!"

"آپ اُس وقت کس جماعت میں پڑھا کرتے تھے؟"

"نویں میں"!

یہ سُنکر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ اُسے اپنے بھائی کا خیال آیا جو نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ وہ اس سے عمر میں دوگنا بڑا تھا اس کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ انگریزی کی کتابیں کئی پڑھ چکا تھا اور اسے ہر وقت نصیحتیں

کیا کرتا تھا۔ یہ کیونکر ممکن تھا۔ کہ اس عمر کا اور اچھا لکھا پڑھا (بڈھا) چوری کرے؟۔ اُسکی
عقل اُس معمہ کو حل نہ کر سکی۔ چنانچہ اُسنے پھر سوال کیا۔ "آپ نے چوری کیوں کی؟"

اِس مشکل سوال نے بڈھے کو تھوڑی دیر کے لئے گھبرا دیا۔ آخر وہ اس کا کیا
جواب دے سکتا تھا؟ اس لئے کہ اس وقت اس کے دماغ میں یہی خیال آیا۔

اُس نے دل میں یہی جواب سوچا۔ مگر اُس نے مطمئن نہ ہو کر یہ بہتر خیال کیا۔ کہ تمام
داستان من و عن بیان کر دے۔

"اس کا جواب میری کہانی ہے۔ جو اب میں تمہیں سنانے والا ہوں۔"

"سنائیے؟"

لڑکے اس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سننے کے لئے اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے
جو الاؤ کے سامنے اپنے سفید بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا اور جسے وہ ایک
بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔

بڈھا کچھ عرصہ تک اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر اُس بھولے ہوئے واقعہ
کے تمام منتشر ٹکڑے فراہم کر کے بولا:

"ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور
کرتا ہے جس پر وہ تمام عمر نادم رہتا ہے۔ میری زندگی میں سب سے بُرا فعل ایک کتاب
کی چوری ہے۔"

یہ کہہ کر وہ رُک گیا۔ اُس کی آنکھیں جو ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں۔ دھندلی پڑ گئیں
اُس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا۔ کہ وہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے
زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر بولا:

"سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے۔ یہ میں نے ایک کتب فروش کی
دکان سے چرائی۔ یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تعلیم
پاتا تھا۔ قدرتی طور جیسا کہ آپ تمہیں کہانی سننے کا شوق مجھے افسانے اور ناول
پڑھنے کا شوق تھا۔ دوستوں سے مانگ کر یا خود خرید کر میں ہر مہینے ایک د

ایک کتاب ضرور پڑھا کرتا تھا وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کے بے معنی داستانیں یا دھرلا جاسوسی قصے ہوا کرتے تھے۔ یہ کتابیں میں ہمیشہ چھپ چھپ کر پڑھا کرتا تھا والدین کو اس بات کا علم نہ تھا اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے ایسا ہرگز ہرگز نہ کرنے دیتے۔ اسلئے کہ اس قسم کی کتابیں اسکول کے لڑکے کے لیئے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میں ان کے مہلک نقصان سے غافل تھا۔ چنانچہ مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ میں نے چوری کی اور پکڑا گیا۔"

ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا "آپ پکڑے گئے؟"

"ہاں پکڑا گیا۔ چونکہ میرے والدین اس واقعے سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ عادت پختے پختے میری طبیعت بن گئی۔ گھر سے جتنے پیسے ملتے میں انہیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا اسکول کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مجھے نفرت ہونے لگی۔ ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سمایا رہتا۔ کہ فلاں کتاب جو فلاں ناول نویس نے لکھی ہے ضرور پڑھنی چاہیئے۔ یا فلاں کتب فروش سے ناولوں کا جو ذخیرہ اس کے پاس موجود ہے۔ ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیئے۔ شوق کی یہ انتہا دوسرے معنوں میں دیوانگی ہے اس حالت میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا۔ کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ یا کر رہا ہے اُس وقت وہ بے عقل بچے کی مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خوش کرنے یا شوق پورا کرنے کے لیئے جلتی ہوئی آگ میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے اُسے یہ پتا نہیں ہوتا کہ چمکنے والی شے جسے وہ پکڑ رہا ہے اس کا ہاتھ جلا دے گی۔ بعینہ یہی حالت میری تھی۔ فرق اتنا ہے کہ بچہ شعور سے محروم ہوتا ہے۔ اس لیئے وہ بغیر سمجھے بوجھے بُری سے بُری حرکت کر بیٹھتا ہے۔ مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہوئے چوری ایسے مکروہ جرم کا ارتکاب کیا ـــــ یہ آنکھوں کی موجودگی میں میرے اندھے ہونے کی دلیل ہے میں ہرگز ایسا کام نہ کرتا۔ اگر میری عادت مجھے مجبور نہ کرتی۔

ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً، اُسے

بڑے کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ یہ شیطان مجھ پر اس وقت غالب آیا، جبکہ سوچنے کے لیے میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ خیر"

لڑکے خاموشی سے بوڑھے کے ہلتے ہوئے لبوں کی طرف نگاہیں گاڑے اُن کی داستان سن رہے تھے۔ داستان کا تسلسل اسوقت ٹوٹتا دیکھ کر جبکہ اصل مقصد بیان کیا جانے والا تھا۔ وہ بڑی بیقراری سے بقایا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

"مسعود بیٹا! یہ سامنے والا دروازہ تو بند کردینا۔ سرد ہوا آرہی ہے" بوڑھے نے اپنا کمبل گھٹنوں پر ڈال لیا۔

مسعود "اچھا تایا جی" کہہ کر اٹھا اور کھڑکی کا دروازہ بند کرنیکے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"ہاں تو ایک دن جبکہ والد گھر سے باہر تھے" بوڑھے نے اپنی داستان کا بقایا حصہ شروع کیا۔ "مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا۔ اور وہ کتاب جو میں ان دنوں پڑھ رہا تھا ختم ہونے کے قریب تھی۔ اسلئے میرے جی میں آئی کہ چلو اُس کتب فروش تک ہو آئیں، جن کے پاس بہت سی جاسوسی ناولیں پڑی تھیں۔

میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے موجود تھے۔ جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کے لیے کافی ہوں۔ چنانچہ میں گھر سے سیدھا اُس کتب فروش کی دوکان پر گیا۔ یوں تو اُس دوکان پر ہر وقت بہت اچھی اچھی ناولیں موجود رہتی تھیں۔ مگر اسوقت خاص طور پر بالکل نئی کتابوں کا ایک ڈھیر باہر تختے پر رکھا تھا۔ ان کتابوں کے رنگ برنگ سرورق دیکھ کر میری طبیعت میں ایک ہیجان سا برپا ہوگیا۔ دل میں اس خواہش نے گدگدی کی۔ کہ وہ تمام میری ہوجائیں

میں دوکاندار سے اجازت لے کر اُن کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہوگیا ہر کتاب کے شوخ رنگ سرورق اس پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"ناممکن ہے کہ ان کا مطالعہ آپ پر سنسنی طاری نہ کردے"

"مصورِ اسرار کا لاثانی شاہکار!"

"تمثیل! ہیجان!! رومان!!! — سب یکجا!"

اِس قسم کی عبارتیں شوق بڑھانے کے لیئے کافی تھیں۔ مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی اس لیئے کہ میری نظروں سے ایسے الفاظ گذر چکے تھے۔ میں تھوڑا عرصہ کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اسوقت میرے دل میں چوری کرنے کا مطلقاً خیال نہ تھا۔ بلکہ میں نے خریدنے کے لیئے ایک کم قیمت کی ناول چنکر الگ بھی رکھ لی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ اِرادہ کر کے میں دوسرے ہفتے ان ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤں گا — میں نے اپنی چنی ہوئی کتاب اٹھائی — کتاب کا اٹھانا تھا کہ میری نگاہیں ایک مجلد ناول پر گڑ گئیں۔ سرِ ورق کے کونے پر میرے محبوب ناولسٹ کا نام سرخ لفظوں میں چھپا تھا۔ اُس کے ذرا اوپر کتاب کا نام تھا۔

"منتقم شعاعیں — کس طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے لندن کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا!"

یہ سطور پڑھتے ہی میرے اشتیاق میں ھیجانی سی آگئی۔ کتاب کا مصنف وہی تھا۔ جس نے اس سے پیشتر مجھ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ ناول کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں خیالات کا ایک گروہ داخل ہو گیا۔

"منتقم شعاعیں — دیوانے ڈاکٹر کی ایجاد — کیا دلچسپ افسانہ ہوگا!"

"لندن تباہ کرنے کا ارادہ — یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"اُس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سنسنی خیز لکھی ہیں!"

"یہ کتاب ضرور اُن سب سے بہتر ہوگی!"

میں خاموش اشتیاق کے ساتھ اُس کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ خیالات یکے بعد دیگرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہے تھے۔ میں نے اُس کتاب کو اٹھایا اور کھول کر دیکھا تو پہلے۔ ورق پر یہ عبارت نظر آئی۔

مصنّف اس کتاب کو اپنی بہترین تصنیف قرار دیتا ہے۔"

"ان الفاظ نے میرے اشتیاق میں آگ پر ایندھن کا کام دیا۔ ایکا ایکی میرے دماغ کے خدا کو کس گوشے سے ایک خیال کود پڑا ــــ وہ یہ کہ میں اس کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کر لے جاؤں۔ میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش کی طرف مُڑیں جو کاغذ پر کچھ لکھنے میں مشغول تھا دوکان کی دوسری طرف دو نوجوان کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے ــــ میں سر سے پیر تک لرز گیا۔

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کا نحیف جسم اس واقعہ کی یاد سے کانپا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اُس نے پھر اپنی داستان شروع کردی: "ایک لحظہ کے لیے میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چوری کرنا بہت برا کام ہے مگر ضمیر کی آواز سرورق پر بنی ہوئی لانبی لانبی شعاعوں میں غرق ہوگئی میرا دماغ "منتقم شعاعیں"، "منتقم شعاعیں"، کی گردان کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانکا اور جھٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر بغل میں دبالی مگر میں کانپنے لگا۔

اس حالت پر قابو پاکر میں کتب فروش کے قریب گیا۔ اور اُس کتاب کے دام ادا کیے۔ جو میں نے پہلے خریدی تھی۔ قیمت لیتے وقت، اور روپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اُس نے غیر معمولی، تاخیر سے کام لیا۔ میری طرف اُس نے گھور کر بھی دیکھا۔ جس سے میری، طبیعت سخت پریشان ہوگئی۔ جی میں بھی آئی کہ سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔

میں نے اِس دوران میں کئی بار اُس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے اُبھری ہوئی تھی نگاہ ڈالی ــــ اور شاید اُسے چھپانے کی بے سود کوشش بھی کی۔ میری ان عجیب و غریب حرکتوں کو دیکھ کر اُسے شک ضرور ہوا۔ اس لیے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرکے پھر خاموش ہو جاتا تھا۔

میں نے باقی پیسے جلدی سے لیئے اور وہاں سے چل دیا۔ دو سو قدم کے فاصلے پر میں نے کسی کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا۔ تو کتب فروش ننگے پاؤں بھاگا آرہا تھا۔ اور مجھے ٹھیر نے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کردیا۔

مجھے معلوم نہ تھا میں کدھر بھاگ رہا ہوں۔ میرا رُخ اپنے گھر کی جانب نہ تھا میں شروع ہی سے اُس طرف بھاگ رہا تھا جدھر بازار کا اختتام تھا۔ اس غلطی کا مجھے اسوقت احساس ہوا جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

بوڑھا اتنا کہہ کر اضطراب کی حالت میں اپنی خشک زبان لبوں پر پھیرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا:۔

"مسعود! پانی کا ایک گھونٹ پلوانا"

مسعود خاموشی سے اٹھا۔ اور کوٹھڑی کے ایک کونے میں پڑے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی انڈیل کر لے آیا بوڑھے نے گلاس لیتے ہی منہ سے لگا لیا اور ایک گھونٹ میں سارا پانی پی گیا۔ اور خالی گلاس زمین پر رکھتے ہوئے کہا " ہاں میں کیا بیان کر رہا تھا۔

ایک لڑکے نے جواب دیا " آپ بھاگ کر جا رہے تھے"

" میرے پیچھے کتب فروش " چور چور " کی آواز بلند کرتا چلا آرہا تھا جب میں نے دو تین آدمیوں کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ جیل کی آہنی سلاخیں، پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ بے عزتی کے خیال سے میری پیشانی عرق آلود ہوگئی میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اُٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ اسوقت میرے دماغ کی عجب حالت تھی۔ ایک تند دھواں سا میرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا۔ آنکھیں فرطِ خوف سے اُبل رہی تھیں۔ اور کانوں میں زبردست شور برپا تھا۔ جیسے بہت سے لوگ آہنی چادریں ہتھوڑوں سے کوٹ رہے ہیں۔ میں اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش

کر ہی رہا تھا کہ کتب فروش اور اُس کے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اسوقت میری کیا حالت تھی اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ سینکڑوں خیالات ہتھوڑوں کی طرح میرے دماغ سے ٹکرا کر مختلف آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ جب انہوں نے مجھے پکڑا تو ایسا معلوم ہوا کہ آہنی پنجہ نے میرے دل کو مسل ڈالا ہے۔ میں بالکل خاموش تھا وہ مجھے دوکان کی طرف کشاں کشاں لے گئے۔

جیل خانے کی کوٹھڑی اور عدالت کا منہ دیکھنا یقینی تھا۔ اس خیال پر میرے ضمیر نے لعنت ملامت شروع کر دی۔ چونکہ اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا اور میرے پاس اپنے ضمیر کو جواب دینے کے لئے کوئی الفاظ موجود نہ تھے۔ اس لئے میری گرم آنکھوں میں آنسو اتر آئے اور میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔"

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دھندلی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

"کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا۔ اپنی کتاب لے لی۔ اور نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔" بوڑھے نے اپنے آنسو کھُردرے کمبل سے خشک کئے۔۔۔ "خدا اُس کو جزائے خیر دے میں عدالت کے دروازے سے تو بچ گیا۔ مگر اس واقعہ کی والد اور اسکول کے لڑکوں کو خبر ہو گئی۔ والد مجھ پر سخت خفا ہوئے۔ لیکن انہوں نے بھی آخر میں مجھے معاف کر دیا۔

دو تین روز مجھے اس ندامت کے باعث بخار آتا رہا اس کے بعد، جب میں نے دیکھا۔ میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں لیتا۔ اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اُٹھا سکوں۔ تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔ اُسوقت سے لے کر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے۔ ہزاروں مصائب برداشت کئے ہیں۔ صرف اُس کتاب کی چوری کی ہے جو مجھے تادمِ مرگ نادم و شرمسار رکھے گی۔

"اس آوارہ گردی کے دوران میں میں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا۔ مگر ان پر نادم نہیں ہوں مجھے فخر حاصل ہے۔"

بوڑھے کی دُھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہوگئی۔ اور اُس نے الاؤ کے شعلوں کی ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ہاں مجھے فخر ہے " یہ لفظ اُس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہے۔

الاؤ میں آگ کا شعلہ بلند ہوا ۔ اور ایک لمحہ فضا میں تھرتھرا کر وہیں سوگیا۔ بوڑھے نے شعلے کی حرارت دیکھی اور مُسکرا دیا۔ پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا " یہ کہانی ختم ہوگئی ہے اب تم جاؤ تمہارے ماں باپ انتظار کرتے ہونگے۔

مسعود نے سوال کیا " مگر آپ کو اپنی دوسری چوریوں پر کیوں فخر ہے ؟ "

" فخر کیوں ہے ؟ " ۔ بوڑھا مسکرا دیا " اِس لیے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں ۔ اپنی مسروقہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں ہوتی میرے عزیز ! " بڑے ہو کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا "

" میں سمجھا نہیں "

" ہر وہ چیز جو تم سے چُرالی گئی ہے ۔ تمہیں حق حاصل ہے کہ اُسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضہ میں لے آؤ یاد رہے تمہاری کوشش کامیاب ہونی چاہیئے ۔ ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اُٹھانا عبث ہے "

لڑکے اُٹھے اور باباجی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازہ سے باہر چلے گئے ۔ بوڑھے کی نگاہیں اُن کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھتی رہیں تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد وہ اُٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا کاش کہ یہ بڑے ہو کر اپنی کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے سکیں " بوڑھے کو خدا معلوم اِن لڑکوں سے کیا اُمید تھی ؟ "

قاسم؟

باورچی خانہ کی مٹ میلی فضا میں بجلی کا اندھا سا بلب کمزور روشنی پھیلا رہا تھا۔ اسٹوپ پر پانی سے بھری ہوئی کیتلی دھری تھی۔ پانی کا کھولاؤ اور اسٹوپ کے حلق سے نکلتے ہوئے شعلے مل جل کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔ انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں راکھ میں سو گئی تھیں۔ دور کونے میں قاسم گیارہ برس کا لڑکا برتن مانجھنے میں مصروف تھا۔ ریلوے انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ ایسے الفاظ تھے۔ جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔

"جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! — بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انہیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا۔ اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیئے بغیر آرام — یہ کیونکر ممکن تھا اسٹوپ بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اگل رہا تھا کیتلی کا پانی اسی طرح انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابل مغلوب حملے کو محسوس کر کے اپنے جسم کو ایک جنبش دی۔ اور "جی آیا صاحب" گنگناتا پھر کام میں

مشغول ہو گیا۔

دیوارگیریوں پر چنے ہوئے برتن سوئے ہوئے تھے۔ پانی کے نل سے پانی کی بوندیں نیچے میلی سِل پر ٹپک رہی تھیں اور اُداس آواز پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا پر غنودگی سی طاری ہے۔ دفعتہً آواز بلند ہوئی۔

"قاسم! قاسم!"

"جی آیا صاحب!" لڑکا جو ابھی الفاظ کی گردان کر رہا تھا۔ بھاگا بھاگا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے گرج کر کہا۔ "بیوقوف کے بچے آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔"

"ابھی لایا صاحب ـــ ابھی لایا صاحب۔"

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کیلئے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اُسی کمرے میں سے آواز آئی۔

"قاسم ـــ قاسم!"

"جی آیا صاحب!" قاسم بھاگتا ہوا پھر اپنے آقا کے پاس گیا۔

"بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے ـــ جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ۔ بس بھاگے جاؤ۔ سخت پیاس لگ رہی ہے۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

قاسم بھاگا۔ بھاگا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے نصف میل کے قریباً فاصلے پر تھا۔ سوڈے کی بوتل لے آیا۔ اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دی۔

"اب تم جاؤ۔ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو؟ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟"

"ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب!"

”برتن صاف کرنے کے بعد میرے دونوں کالے شو پالش کر دینا۔ مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے۔ ورنہ —“

قاسم کو ”ورنہ“ کے بعد کا جملہ بخوبی معلوم تھا۔ ”بہت اچھا صاحب“ کہہ کر وہ باورچی خانہ میں چلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیئے۔

اب نیند اس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں۔ سر میں پگھلا ہوا سیسہ اتر رہا تھا — یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں قاسم نے اپنے سر کو بہت زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

”جی آیا صاحب، جی آیا صاحب، بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہاں صاحب“

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رکا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ نیند ضرور غالب آ کر رہے گی۔ پر ابھی برتنوں کو دھو کر انہیں ان کی جگہ رکھنا باقی تھا۔ جب اس نے یہ سوچا تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں آیا۔ ”بھاڑ میں جائیں برتن اور چولہے میں جائے شو — کیوں نہ تھوڑی دیر سو جاؤں اور پھر چند لمحہ آرام کرنے کے بعد۔“

اس خیال کو باغیانہ تصور کر کے قاسم نے ترک کر دیا اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آئی کہ ابلتا ہوا پانی اپنے سر پر انڈیل لے اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی نجات پائے۔ مگر پانی اتنا گرم تھا کہ اس کے بھیجے تک کو پگھلا دیتا۔ چنانچہ منہ پر پانی کے ٹھنڈے چھینٹے مار مار کر اس نے باقی ماندہ برتن صاف

سکیے۔ یہ کام کرنے کے بعد اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ آرام سے سو سکتا تھا۔ اور نیند — وہ نیند، جس کے لئے اُس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانہ کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھا لیا۔ اور لیٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ نیند اُسے اپنے نرم نرم بازوؤں میں تھام لے اُس کے کان "شو۔ شو" کی آواز سے گونج اُٹھے۔

"بہت اچھا صاحب۔ ابھی پالش کرتا ہوں" قاسم ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔

ابھی قاسم شو کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا۔ کہ نیند کے غلبہ نے اُسے وہیں سلا دیا۔

سورج کی لال لال کرنیں مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں مگر قاسم سویا رہا۔

جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں اپنے کالے جوتوں کے پاس سویا دیکھا تو اُسے ٹھوکر مار کے جگاتے ہوئے کہا۔ "یہ سور کی طرح یہاں بیہوش پڑا ہے۔ اور مجھے خیال تھا کہ اُس نے شو صاف کر لئے ہونگے — نمک حرام! — ابے قاسم"

"جی آیا صاحب!"

قاسم فوراً اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ میں جب اُس نے پالش کرنے کا برش دیکھا اور رات کے اندھیرے کی بجائے دن کی روشنی دیکھی۔ تو اُس کی جان خطا ہو گئی۔

"میں سو گیا تھا! مگر — مگر شو ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب" یہ کہہ کر اُس نے جلدی جلدی پالش کرنا شروع کر دیا۔

پالش کرنے کے بعد اُس نے اپنا بستر بند کیا۔ اور اُسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

"قاسم!"

"جی آیا صاحب!"

قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے اس لیے باورچیخانہ کے تمام برتن اچھی طرح صاف رکھنا۔ فرش دُھلا ہوا ہونا چاہیے اس کے علاوہ تمہیں ڈرائنگ روم کی تصویریں، میزیں اور کرسیاں بھی صاف کرنا ہونگی۔ سمجھے! خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار والا چاقو پڑا ہے، اُسے مت چھیڑنا میں اب دفتر جا رہا ہوں۔ مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے پہلے ہو جائے۔"

"بہت بہتر صاحب"

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اُس نے باورچی خانہ کا سارا کام ختم کر دیا۔ اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھنچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کے گرد برتن ہی برتن پڑے اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے۔ ہوا زوروں پہ چل رہی ہے۔ جس سے وہ راکھ اڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے۔ یکا یک اس ظلمت میں ایک سُرخ آفتاب نمودار ہوا! جس کی کرنیں سُرخ برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھس گئیں زمین خون سے شرابور ہو گئی۔

قاسم دہشت زدہ ہو گیا۔ اور اس وحشت ناک تصور کو دماغ سے جھٹک کر "جی آیا صاحب، جی آیا صاحب" کہتا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کے تصور میں ایک اور منظر رقص کرنے لگا چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے دفعتہً آندھی چلنے لگی۔ جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا یہ دیو ان سب لڑکوں کو نگل گیا۔ قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیو اُس کے آقا کے ہم شکل تھا۔ گو کہ قد و قامت کے لحاظ سے وہ اُس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اُس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا۔ قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا۔ اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کیا۔ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد وہ میز صاف کرنے کے لئے بڑھا تو اُسے خیال آیا "آج مہمان آ رہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنے پڑیں گے۔ نیند بمبخت پھر ستائے گی۔ مجھ سے تو ہو بھی نہ سکے گا۔"

وہ یہ سوچ رہا تھا اور میز پر رکھی چیزوں کو پونچھ رہا تھا۔ اچانک اسے قلمدان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا — یہی چاقو جس کے متعلق اُس کے آقا نے کہا تھا۔ بہت تیز ہے، چاقو کا دیکھنا تھا کہ اسکی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے — "چاقو تیز دھار چاقو! یہی تمہاری مصیبت ختم کر سکتا ہے۔"

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اُٹھا کے اپنی اُنگلی پر پھیر لیا اب وہ شام کو برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دُور تھا۔ اور نیند — پیاری پیاری نیند اُسے باآسانی نصیب ہو سکتی تھی۔

اُنگلی سے سُرخ، خون کی دھاری بہ رہی تھی۔ سامنے والی دوات کی سُرخ روشنائی سے چمکیلی۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسرت، بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور منہ گنگنا رہا تھا "نیند، نیند — پیاری نیند"

—

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنان خانہ میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ اور اپنی اُنگلی دکھا کر کہنے لگا ــــ "دیکھیے بی بی جی"

"ارے، قاسم یہ تو نے کیا کیا؟ ــــ کمبخت، صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہوگا تو نے"

قاسم مسکرا دیا "بی بی جی ــــ بس میز صاف کر رہا تھا کہ اُسنے کاٹ کھایا"

"سو ٹراب ہنستا ہے، ادھر آ، میں اس پہ کپڑا باندھ دوں ــــ پر اب یہ تو بتا کہ آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟"

قاسم اپنی فتح پر جی ہی جی میں بہت خوش ہوا۔

اُنگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں چلا آیا۔ میز پر سے خون کے دھبے صاف کرنے کے بعد اُس نے خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔ سامنے طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ اس کی طرف قاسم نے مسرت بھرے لہجے میں کہا "اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہونگے ــــ اور ضرور صاف کرنے ہونگے کیوں میاں مٹھو؟"

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانہ میں جھوٹے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا۔ انسپکٹر صاحب کی انگلی دیکھ کر بہت بڑے باورچی کھول کر اسے گالیاں دیں مگر اسے مجبور نہ کر سکے ــــ شاید اس وجہ سے کہ ایک بار اُن کی اپنی انگلی میں قلم تراش چبھ جانے سے بہت درد ہوا تھا۔

آقا کی خفگی آنے والی مسرت نے بھلا دی۔ اور قاسم کو دمکا چھاتا رہا اپنے بستر پر جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا۔ مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا ــــ اب وہی مصیبت پھر نمودار ہوگئی

"قاسم ــــ صاحب کی جرابیں اور قمیص دھو ڈالو"

"بہت اچھا بی بی جی"

"قاسم اس کمرے کا فرش کتنا میلا ہو رہا ہے ۔ پانی لا کر ابھی صاف کر دو ۔ دیکھنا کوئی داغ دھبّہ باقی نہ رہے!"

"بہت اچھا صاحب۔"

"قاسم، شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں ۔ انہیں نمک سے ابھی ابھی صاف کرو۔"

"ابھی کرتا ہوں بی بی جی۔"

"قاسم، ابھی بھنگن آ رہی ہے ۔ تم پانی ڈالتے جانا وہ سیڑھیاں دھو ڈالے گی۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

"قاسم ذرا بھاگ کے ایک آنہ کا دہی تو لے آنا!"

"ابھی چلا بی بی جی۔"

پانچ چھ روز اس قسم کے احکام سننے میں گذر گئے ۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا ۔ ہر روز اُسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا ۔ پھر علی الصباح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لئے چائے تیار کرنی پڑتی یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کیلئے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اُس کا ہاتھ خود چاقو کی طرف بڑھا اور ایک لمحہ کے بعد اُس کی انگلی سے خون بہنے لگا ۔ انسپکٹر صاحب اور اُن کی بیوی قاسم کی اِس حرکت پر سخت خفا ہوئے چنانچہ سزا کی صورت میں اُسے شام کا کھانا نہ دیا گیا ۔ مگر قاسم خوش تھا — ایک وقت روٹی نہ ملی ۔ اُنگلی پر معمولی سا زخم آ گیا ۔ مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے تو نجات مِل گئی — یہ سودا کیا بُرا ہے ۔

چند دنوں کے بعد اُس کی اُنگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا ۔ اب پھر کام کی وہی بھرمار تھی ۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گذر گئے اس عرصہ میں قاسم

نے بارہا ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کر لے۔ مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا تھا اور باورچی خانہ والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب قاسم کو ہر وقت باورچی خانہ میں رہنا پڑا۔ کبھی مرچیں پیستا، کبھی آٹا گوندھتا، کبھی آگ سلگاتا، غرض صبح سے لیکر شام تک اُس کے کانوں میں "اے قاسم یہ کر! اے قاسم وہ کر!" کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا۔ قاسم کی ننھی سی جان اور ہمت جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب نے اُسے الماری صاف کرنے کو کہا جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اُسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ پکڑتے ہی اُس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز انگلی میں دور تک چلی گئی۔ جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔

قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہو جائے مگر زخم کا منہ بڑا تھا۔ سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا۔ بھاگا ہوا انسپکٹر کی بیوی کے پاس گیا۔

"بی بی جی، میری انگلی میں صاحب کا اُسترا لگ گیا ہے"

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا تو فوراً معاملے کو سمجھ گئی چپ چاپ اٹھی اور کپڑا نکال کر اُس کی انگلی پر باندھ دیا۔ اور کہا۔ قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے"

"کیوں بی بی جی؟"

"صاحب سے پوچھنا"

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور پیلا پڑ گیا۔

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے لوٹے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سُن کر اُسے فوراً اپنے پاس بُلا لیا۔

"کیوں میاں یہ اُنگلی ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی ؟"

قاسم خاموش کھڑا رہا۔

"تم نوکر لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم اندھے ہیں۔ اور ہمیں بار بار دھوکہ دیا جاسکتا ہے ۔۔۔ اپنا بوریہ بستر دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ ۔ ہمیں تم جیسے نوکروں کی ضرورت نہیں ہے ۔۔۔ سمجھے !"

"مگر ۔۔ مگر صاحب "

"صاحب کا بچہ ۔۔۔ بھاگ جا یہاں سے ، تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا ۔۔۔ اب میں اور کچھ نہیں سُننا چاہتا ۔"

قاسم کو افسوس نہ ہوا بلکہ خوشی محسوس ہوئی کہ چلو کام سے کچھ دیر کے لئے چھٹی مل گئی ۔ گھر سے نکل کر وہ اپنی زخمی اُنگلی سے بے پرواہ سیدھا چوپاٹی پہونچا اور وہاں ساحل کے پاس ایک بنچ پر لیٹ گیا اور وہیں سو گیا۔

چند دنوں کے بعد اُس کی اُنگلی کا زخم بداحتیاطی کے باعث سیپٹک ہوگیا ۔ سارا ہاتھ سُوجھ گیا ۔ جس دوست کے پاس وہ ٹھہرا تھا اُس نے اپنی دانست کے مطابق اُس کا بہتر علاج کیا مگر تکلیف بڑھتی گئی ۔ آخر قاسم خیراتی ہسپتال میں داخل ہوگیا ۔ جہاں اُس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا ۔

اب جب کبھی قاسم اپنا کٹا ہوا ٹُنڈ مُنڈ ہاتھ بڑھا کر فلورا فاؤنٹین کے راہ گیر لوگوں سے بھیک مانگتا ہے تو اُسے وہ بلیڈ یاد آجاتا ہے۔

جس نے اُسے بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔ اب وہ جس وقت چاہے سر کے نیچے اپنی گدڑی رکھ کر فٹ پاتھ پر سو سکتا ہے اُس کے پاس ٹین کا ایک چھوٹا سا بھبھکا ہے جس کو کبھی نہیں مانجھتا، اِس لئے کہ اسے انسپکٹر صاحب کے گھر کے وہ برتن یاد آجاتے ہیں جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔

دیوانہ شاعر

"میں آہوں کا بیوپاری ہوں،
لہو کی شاعری میرا کام ہے،
چمن کی درماندہ ہواؤ!
اپنے دامن سمیٹ لو — کہ
میرے آتشیں گیت،
دبے ہوئے سینوں میں تلاطم برپا کرنے والے ہیں"

یہ بے باک نغمہ درد کی طرح اٹھا، اور باغ کی فضا میں، چند لمحے تھرتھرا کر ڈوب گیا۔ آواز میں دیوانگی سی تھی —— ناقابلِ بیان، میرے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی میں نے آواز کی جستجو میں اِدھر اُدھر نگاہیں اٹھائیں۔ سامنے چبوترے کے قریب گھاس کے تختے پر چند بچے اپنی ماماؤں کے ساتھ کھیل کود میں محو تھے، پاس ہی دو تین گنوار بیٹھے تھے اور گنّا چوس رہے تھے۔ بائیں طرف نیم کے درختوں کے نیچے مالی زمین کھودنے میں مصروف تھا میں ابھی اسی جستجو ہی میں تھا کہ وہی درد میں ڈوبی ہوئی آواز پھر بلند ہوئی۔

"میں اُن لاشوں کا گیت گاتا ہوں،

ایک کھڑکی پر نگاہیں جمائے تھا۔ شام کے خاکستری دھندلکے میں وہ ایک سایہ دکھائی دیتا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ گنگنایا۔

"آہ! یہ سب کچھ خوفناک حقیقت ہے — کسی صحرا میں جنگلی انسان کے پیروں کے نشانات کی طرح خوفناک!"

"کیا کہا؟"

میں ان الفاظ کو اچھی طرح نہ سُن سکا تھا۔ جو اُس نے منہ ہی منہ میں ادا کئے تھے۔

"کچھ نہیں!" وہ میرے پاس چبوترے پر بیٹھ گیا۔

"مگر آپ گنگنا رہے تھے؟"

اس پر اُس نے اپنی آنکھیں ایک عجیب انداز سے سُکیڑیں۔ اور ہاتھوں کو آپس میں زور زور سے ملنا شروع کیا "سینے میں قید کئے ہوئے الفاظ باہر نکلنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں۔ اپنے آپ سے بولنا اس الوہیت سے گفتگو کرنا ہے جو ہمارے دل کی پہنائیوں میں مستور ہوتی ہیں۔" پھر ساتھ ہی گفتگو کا رُخ بدل دیا "کیا آپ نے وہ کھڑکی دیکھی ہے؟"

اُس نے اپنی اُنگلی اُس کھڑکی کی طرف اٹھائی۔ جیسے وہ چند لمحہ پہلے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس جانب دیکھا۔ چھوٹی سی کھڑکی تھی جو سامنے دیوار کی خستہ اینٹوں میں سوئی معلوم ہوتی تھی۔

میں نے کہا "یہ کھڑکی جس کا ڈنڈا نیچے لٹک رہا ہے؟"

"ہاں — یہی، جس کا ایک ڈنڈا نیچے لٹک رہا ہے، کیا تم اس پر، اُس معصوم لڑکی کے خون کے چھینٹے نہیں دیکھتے۔ جس کو صرف اِس لئے ہلاک کیا گیا تھا کہ ترکش اِسفندیار کو اپنے تیروں کی قوت پرواز کا امتحان لینا تھا — میرے عزیز! تمہاری اس بہن کا خون ضرور لائے گا۔ میرے گیتوں کے زیر و بم میں اس کم سن رُوح کی پھڑپھڑاہٹ اور اس کی دلدوز

چیختیں ہیں۔ یہ سکون کے دامن کو تار تار کر دے گی۔ ایک ہنگامہ ہوگا۔ سینۂ گیتی شق ہو جائے گا۔ میری بے لگام آواز بلند سے بلند تر ہو جائے گی ــــ پھر کیا ہوگا؟ ــــ پھر کیا ہوگا؟ ــــ پھر کیا ہوگا ــــ یہ مجھے معلوم نہیں ــــ آؤ دیکھو، اس سینے میں کتنی زبردست آگ لگ رہی ہے!"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اور اُسے کوٹ کے اندر لے جاکر اپنے سینے پر رکھ دیا۔ اُس کے ہاتھوں کی طرح اُس کا سینہ بھی غیر معمولی طور پر گرم تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں کے ڈورے بہت اُبھرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا "آپ علیل ہیں۔ کیا میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں؟"

"نہیں میرے عزیز، میں علیل نہیں ہوں" اس نے زور سے اپنے سر کو جنبش دی "یہ انتقام ہے جو میرے اندر گرم سانس لے رہا ہے۔ میں اس دبی ہوئی آگ کو اپنے گیتوں کے دامن سے ہوا دیتا ہوں کہ یہ شعلوں میں تبدیل ہو جائے"

"یہ درست ہے مگر آپ کی طبیعت خراب ہے۔ آپ کے ہاتھ گرم ہیں۔ اس سردی میں، آپ کو زیادہ بخار ہونے کا اندیشہ ہے۔

اُس کے ہاتھوں کی غیر معمولی گرمی اور آنکھوں میں اُبھرے ہوئے سُرخ ڈورے صاف طور پر ظاہر کر رہے تھے کہ اُسے تیز بخار ہے"

اُس نے میرے کہنے کی کوئی پروا نہ کی اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر میری طرف بڑے غور سے دیکھا۔

"یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آگ جلے اور دھواں نہ دے ــ میرے عزیز اِن آنکھوں نے ایسا سماں دیکھا ہے کہ انہیں اُبل کر باہر نکل آنا چاہیے

تھا۔ کیا کہہ رہے تھے میں علیل ہوں ۔۔ ہا ہا ہا —— عدالت! — کاش کہ سب لوگ میری طرح علیل ہوتے —— جائیے آپ ایسے، نازک مزاج میری آنکھوں کے خریدار نہیں ہو سکتے۔"

"مگر........"

"مگر وہ کچھ نہیں" وہ دفعتہً جوش میں چلّانے لگا "انسانیت کے بازار میں صرف تم لوگ باقی رہ گئے ہو جو کھوکھلے قہقہوں۔ اور، پھیکے تبسموں کے خریدار ہو۔ ایک زمانے سے تمہارے مظلوم بھائیوں اور بہنوں کی فلک۔ شگاف چیخیں تمہارے کان ٹکرا رہی ہیں مگر تمہاری خوابیدہ سماعت میں ارتعاش پیدا نہیں ہوا۔ آؤ، اپنی روح کو میری آہوں سے آنچ دو۔ یہ اُنہیں حساس بنا دے گی!

میں اُس کی گفتگو غور سے سُن رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ اور اُس کے خیالات اس قدر پریشان و مضطرب کیوں ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وہ شاید پاگل ہے اس کی گفتگو بامعنی ضرور تھی۔ مگر لہجہ میں ایک عجیب قسم کی دیوانگی تھی۔ اُس کی عمر کوئی یہی پچیس تیس برس کے قریب ہوگی۔ ڈاڑھی کے بال جو ایک عرصہ سے مونڈے نہ گئے تھے۔ کچھ اس انداز میں اُس کے چہرے پر اُگے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی خشک روٹی پر بہت سی چیونٹیاں چمٹی ہوئی ہیں۔ گال اندر کو پچکے ہوئے، ماتھا، باہر کی طرف اُبھرا ہوا ناک نوکیلی، آنکھیں بڑی بڑی جن سے وحشت ٹپکی تھی۔ سر پر خشک اور خاک آلود بالوں کا ایک ہجوم بڑے سے بھورے کوٹ میں وہ واقعی شاعر معلوم ہوتا تھا۔

—— دیوانہ شاعر، جیسا کہ خود اُس نے اس نام سے اپنے آپ کو متعارف کرایا تھا۔

میں نے اکثر اوقات اخباروں میں ایک جماعت کا حال پڑھا تھا،

اس جماعت کے خیالات دیوانے شاعر کے خیالات سے بہت ملتے جلتے تھے، میں نے خیال کیا کہ شاید وہ بھی اسی جماعت کا رکن ہے۔

"آپ انقلابی معلوم ہوتے ہیں"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا "آپ نے بہت بڑا انکشاف کیا ہے —— میاں میں تو کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ کر پکارتا ہوں۔ میں انقلابی ہوں —— میں انقلابی ہوں —— مجھے روک لے جس سے بن پڑے۔ آپ نے واقعی بہت بڑا انکشاف کیا ہے"

وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

"اسکول کے طالب علموں کی طرح انقلاب کے حقیقی معانی سے تم بھی نا آشنا ہو، انقلابی وہ ہے جو ہر ناانصافی اور ہر غلطی پر چلا اٹھے انقلابی وہ ہے جو سب زمینوں، سب آسمانوں، سب زبانوں اور سب وقتوں کا ایک مجسم گیت ہو۔ انقلابی سماج کے قصاب خانے کی بیمار اور فاقوں، مری بھیڑ نہیں، وہ مزدور ہے تنو مند۔ جو اپنے آہنی ہتھوڑے کی، ایک ضرب ہی سے ارضی جنت کے دروازے وا کر سکتا ہے۔ میرے عزیز! یہ منطق، خوابوں اور نظریوں کا زمانہ نہیں۔ انقلاب ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ تمہارے سامنے موجود ہے۔ اس کی لہریں بڑھ رہی ہیں۔ کون ہے جو اس کو روک سکتا ہے"

اُس کا ہر لفظ ہتھوڑے کی اُس ضرب کے مانند تھا جو سرخ لوہے پر پڑ کر اس کی شکل تبدیل کر رہا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ میری روح کسی غیر مرئی چیز کو سجدہ کر رہی ہے۔

شام کی تاریکی بتدریج بڑھ رہی تھی، نیم کے درخت کپکپا رہے تھے میرے سینے میں ایک نئی دُنیا آباد ہو رہی تھی۔ اچانک میرے دل سے کچھ الفاظ اُٹھے اور لبوں سے باہر نکل گئے۔

"اگر انقلاب یہی ہے، تو میں بھی انقلابی ہوں!"
شاعر نے اپنا سر اٹھایا اور میرے کاندھے پر، ہاتھ رکھا۔
تو پھر اپنے خون کو کسی طشتری میں نکال کر رکھ چھوڑ دو، کہ ہمیں آزادی کے کھیت کے لئے اس سرخ کھاد کی بہت ضرورت ہے ___ آہ! وہ "وہ" وقت کس قدر خوشگوار ہوگا۔ جب میری آہوں کی زردی تبسم کا رنگ اختیار کر لے گی"
یہ کہہ کر وہ کنئیں کی منڈیر سے اُٹھا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:۔

"اس دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو حال سے مطمئن ہیں۔ اگر تمہیں اپنی روح کی بالیدگی منظور ہے تو ایسے لوگوں سے ہمیشہ دور رہنے کی سعی کرو۔ ان کا احساس پتھرا گیا ہے۔ مستقبل کے جاں بخش مناظر ان کی نگاہوں سے ہمیشہ اوجھل رہیں گے......
اچھا، میں اب چلتا ہوں"
اُس نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ دبایا اور پیشتر اس کے کہ میں اس سے کوئی اور بات کرتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا

باغ کی فضا پر خاموشی طاری تھی۔ میں سر جھکائے خدا معلوم کتنے عرصہ اپنے خیالات میں غرق رہا۔ کہ اچانک اس شاعر کی آواز رات کی رانی، کی دل نواز خوشبو میں گھلی ہوئی میرے کانوں تک پہونچی۔ وہ باغ کے دوسرے گوشے میں گا رہا تھا:۔

"زمین ستاروں کی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے
اُٹھو، اور نگینوں کو اُس کے ننگے سینے میں جڑ دو۔
ڈھاؤ، کھودو، چیرو، مارو!

نئی دنیا کے معمارو! کیا تمہارے بازوؤں میں قوت نہیں ہے؟
میں آہوں کا بیوپاری ہوں۔
لہو کی شاعری میرا کام ہے۔

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاونی میں جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اُس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اُس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا: "دِس لیف — ویری بیڈ" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے۔ جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاونی میں اُس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاونی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے، اِس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر اُن کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی "صاحب ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا" اور اگر وہ اُس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ اُن کو اپنی زبان میں گالیاں دینی شروع کر دیتی تھی۔

وہ حیرت میں اُس کے مُنہ کی طرف دیکھتے تو وہ اُن سے کہتی "صاحب ایکدم اُلّو کا پٹھا ہے - حرام زادہ ہے ـــــ سمجھا" یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ اُن سے باتیں کرتی یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اُلّو کے پٹھے دکھائی دیتے -

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا - تین مہینے اُس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے - جہاں اُس نے سُنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں ، جو گرمیوں میں شملے میں چلے جاتے ہیں ، مگر صرف چھ آدمی اُس کے پاس آئے تھے - صرف چھ یعنی مہینے دو - اور ان چھ گاہکوں سے اُس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے ، تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے - تین روپے سے زیادہ پر ، کوئی مانتا ہی نہیں تھا - سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا - مگر تعجب کی بات ہے کہ اُن میں سے ہر ایک نے یہی کہا "بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے" نہ جانے کیا بات تھی کہ اُن میں سے ہر ایک نے اُسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا - چنانچہ جب چھٹا آیا تو اُس نے خود اُس سے کہا "دیکھو ، میں تین روپے ایک ٹیم کے لونگی - اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو میں نہ لونگی اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ" چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اُس کے ہاں ٹھہر گیا جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا "لایئے ایک روپیہ دودھ کا" اس نے ، ایک روپیہ تو نہ دیا - لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب سے نکال کر اُس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے -

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں -- بیس روپے ماہوار

تو اُس کو مٹے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اُسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیئے اس پاخانہ میں گئی تو اُس کی کمر میں شدّت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اُس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اُس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیئے تیار کیئے گئے ہیں یہ زنجیر اس لیئے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اُس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اُس نے سلطانہ کی چیخ سنی وہ دوڑ کر باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا "کیا ہوا؟ — یہ چیخ تمہاری تھی؟"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس نے کہا "یہ موا پیخانہ ہے یا کیا ہے۔ یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکہ ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اُس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اُس نے لاری چلانا سیکھا، چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا اس کے بعد کشمیر میں اُس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اِس لیے اُس نے عورت کو پیشے پر بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اسی کی تلاش میں انبالہ آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی سلطانہ نے اُس کو پسند کیا، چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لیے اُس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی، چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اُس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا اس لیے اُس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اُس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا، چنانچہ اُس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اُس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو

وہیں لے گیا یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سُلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اُس کی آمدنی پہلے سے دوگنی ہو گئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولہ کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوالیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی۔ مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دِل میں کیا سمائی کہ اُس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کیا کرتی تھی۔ اُس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا بلکہ اُس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ اُن کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی، چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر خدا بخش کے ساتھ دہلی آگئی یہاں پہونچکر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دوکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں، اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی پر جب لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اسکو ایک نشانی مل گئی۔ یہاں میلے کپڑوں کی دُھلائی کیجاتی ہے۔" یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا تھی۔ اسی طرح اُس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں کوئلوں کی دوکان لکھا

تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا۔ وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ بُنے کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانہ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دوکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بے کار رہی تو اُس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اُس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اُسے بہت تشویش ہوئی، اُس نے خدا بخش سے کہا "کیا بات ہے خدا بخش، دو مہینے آج پورے ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے اِدھر کا رُخ بھی نہیں کیا ۔۔۔ مانتی ہوں آجکل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔" خدا بخش کو بھی یہ بات عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اُس نے کہا "میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ......" وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا یہ پہلا گاہک تھا۔ جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے آٹھ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے۔ کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو۔ اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا "تم میری سنو اور چلو...... واپس انبالے میں۔ یہاں کیا دھرا ہے؟ ۔ بھئی ہوگا پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔"

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "نہیں جان من۔ انبالہ اب نہیں جائیں گے، یہیں رہ کر دہلی میں کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دیگا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی، چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا، پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی اب سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اسکا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی، مگر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو

بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اُس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکونی میں آکر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی۔ اور سامنے ریلوے، شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کوٹھے سے اُس کوٹھے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں رہتی تھیں۔ اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بیشمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی۔ جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی ابھری رہتی تھیں، اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں، کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اُٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا۔ اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اُٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اُسے اپنا خیال آتا وہ سوچتی کہ اُسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔

——— نہ جانے کہاں - پھر ایک روز ایسا آئے گا - جب اُس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رُک جائے گی - کسی ایسے مقام پر جو اُس کا دیکھا بھالا ہو گا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی اِن ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھیرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی پر طرح طرح کے خیال اُس کے دماغ میں آتے رہتے تھے - انبالہ چھاونی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اُس کا مکان تھا مگر وہاں اُس نے کبھی اِن چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا - اب بھی تو کبھی کبھی اُس کے دماغ میں یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ دُھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو موٹے موٹے انجن اِدھر اُدھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے ہیں جو کبھی کبھی انبالہ میں اُس کے ہاں آیا کرتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گذرتا دیکھتی تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے چنانچہ جب اِس قسم کے خیال اُس کو آنے لگے تو اُس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدابخش سے اُس نے بارہا کہا ”دیکھو میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں ۔“ مگر اُس نے بارہا سلطانہ سے یہ کہہ کر اسکو تشفی کر دی ”جانِ من ۔ میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار، ہو جائے گا ۔“

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے، مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیئے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی۔ جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیئے اُس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی اُس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی۔ کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اُس کو احساس نے بہت دُکھ دیا کہ وہ محرم منانے کیلئے ایسا لباس خرید لینے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسب معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی، پر جب اُس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اُٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی تا کہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے۔ پر انجن کوئی بھی نہ تھا شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا اس لیئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اُسکو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں

پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے دیکھنا اس کی طرف شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اُس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اُس نے سڑک کی جانب دیکھا۔ تو اُسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اُس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اُسے اشارہ کیا۔ اُس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں، سلطانہ نے اُسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اُسے دری پر بٹھا دیا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اُس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لیئے کہا: "آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے۔" وہ آدمی یہ سُن کر مسکرایا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟"

اِس پر سلطانہ نے کہا: "یہ میں نے اس لیئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر اِدھر آئے۔" وہ یہ سُن کر پھر مسکرایا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی ہے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر پسند آیا۔ پھر، بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کیلئے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔" یہ کہکر اُس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا: "آپ جا رہے ہیں؟" اُس آدمی نے جواب دیا: "نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں — چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیئے۔ اُس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اُس آدمی نے کہا: "میرا نام شنکر ہے۔"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اُس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا، اور کسرتی بدن کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اُس نے شنکر سے کہا "فرمائیے......"

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا۔ "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے۔" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا "میں اب سمجھا، لو مجھ سے سنو، جو کچھ ہم نے سمجھا، غلط ہے میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔"

سلطانہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اُسے بے اختیار ہنسی آگئی "آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا "یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں...... میں...... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا۔"

سلطانہ نے بھنّا کر کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی — آپ کچھ نہ کچھ ضرور

کرتے ہوں گے"۔

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی"۔

"جھک مارتی ہوں"۔

"میں بھی جھک مارتا ہوں"۔

"تو آؤ دونوں جھک ماریں"۔

"میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا"۔

"ہوش کی دوا کرو۔ یہ لنگر خانہ نہیں"۔

"اور میں بھی والنٹیر نہیں ہوں"۔

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں"۔

شنکر نے جواب دیا۔ "اُلّو کے پٹھے"۔

"میں بھی اُلّو کی پٹھی نہیں"۔

"مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے۔ ضرور اُلّو کا پٹھا ہے"۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے"۔ یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا۔ "تم ہندو ہو، اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو"۔

شنکر مسکرایا۔ "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے پنڈت مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں"۔

".. جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو — بولو رہو گے ؟"

"وہ اُسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں"

سلطانہ اُٹھ کھڑی ہوئی " جاؤ تو رستہ پکڑو "

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا " میں کبھی کبھی اس بازار سے گذرا کرتا ہوں جب بھی تمہیں ضرورت ہو بلا لینا —— میں بہت کام کا آدمی ہوں "

شنکر چلا گیا۔ اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اُس کے دُکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں وہ خوشحال تھی تو اُس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکّے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اُداس رہتی تھی اس لئے شنکر کی باتیں اُسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اُس سے پوچھا " تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو ؟"

خدا بخش تھک کر چُور چُور ہو رہا تھا، کہنے لگا " پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھیرے ہوئے ہیں اُن ہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں "

".. کچھ انہوں نے تم سے کہا ؟"

"وہ نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔ پر سلطانہ میں جو اُنکی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہ جائے گی۔ اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

سلطانہ کے دماغ میں محرّم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی " سارا دن گھر سے غائب رہتے ہو میں یہاں پنجرے میں

قید رہتی ہوں، نہ کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں، محرم سر پر آگیا ہے، کچھ تم
نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں
کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں، اب تم ہی بتاؤ کیا ہوگا؟
ـــ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا
دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری
سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا: "پر یہ کام شروع کرنے کے لیے
بھی تھوڑا سا سرمایہ چاہیئے ـــ خدا کے لیے تم ایسی دکھ کی کبھی باتیں نہ کرو۔
مجھ سے اب...... برداشت نہیں ہو سکتیں میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے
میں سخت غلطی کی، پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے
لیے کرتا ہے کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد
ہم......"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو، یا
ڈاکہ مارو، پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس ایک سفید بوسکی
کی قمیص پڑی ہے، اس کو میں کالا رنگ ڈالوں گی۔ سفید نینوں کا ایک
نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے دیوالی پر مجھے لا کر
دیا تھا یہ بھی قمیص کے ساتھ کالا ہی رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار
کی کسر ہے سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو...... دیکھو تمہیں میری جان
کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو ـــ میری بھتی کھاؤ اگر نہ
لاؤ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹھا "اب تم خواہ مخواہ زور دیے چلی جا رہی
ہو ـــ میں کہاں سے لاؤں گا ـــ افیم کھانے کے لیے تو میرے
پاس پیسہ نہیں۔"

"کچھ بھی کرو مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لادو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیجدے۔"

"لیکن تم کچھ نہیں کروگے۔ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کرسکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنہ گز مل جاتی تھی، اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گز پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ "تو اب ان باتوں کو بھول جاؤ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی خدابخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ اِدھر اُدھر کمروں میں ٹہلتی رہی، دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینوں کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لئے دی آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ اُن کے ہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اُس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے ہوئے وہ سو گئی، جب اٹھی تو چار بج چکے تھے۔ کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہونچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آکھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہو گئی تھی۔ اب بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اُسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچکر اُسنے گردن اونچی کی اور

سلطانہ کی طرف - دیکھ کر مُسکرایا- سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اُسے اوپر بُلا لیا-

جب شنکر اوپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اُس سے کیا کہے دراصل -

اُس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اُسے اشارہ کر دیا تھا- شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اُس کا اپنا گھر ہے، چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا- جب سلطانہ نے دیر تک اُس سے کوئی بات نہ کی تو اُس نے کہا "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ - میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی- کہنے لگی "نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے"

شنکر اس پر مُسکرا دیا "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں"

"کیسی شرطیں؟"، سلطانہ نے ہنس کر کہا "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ ــ نہ تم عمر بھر کسی سے شادی کرو گی نہ میں- یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں ــ چھوڑو اِن فضولیات کو- کوئی کام کی بات کرو"

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو ــ کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دِل بہل جائے اس دُنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، اور بھی کچھ ہے"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی - کہنے لگی "صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو"

"جو دوسرے چاہتے ہیں" اُٹھ بیٹھ گیا-

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا"

،،تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ اُن میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں، خود ہی سمجھنا چاہئیں۔‘‘

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا: ’’میں سمجھ گئی ہوں۔‘‘

،،تو کہو، کیا ارادہ ہے؟‘‘

،،تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔‘‘

،،تم غلط کہتی ہو — اِسی محلے میں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی۔ جو کبھی یقین بھی نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلّت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کر رہی ہو — لیکن اُن کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو — تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟‘‘

،،سلطانہ ہی ہے۔‘‘

شنکر اُٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا: ’’میرا نام شنکر ہے — یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں، چلو آؤ اندر چلیں۔‘‘

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے، نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا: ’’شنکر میری ایک بات مانو گے؟‘‘

شنکر نے جواباً کہا: ’’پہلے بات بتاؤ۔‘‘

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی: ’’تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر...‘‘

،،کہو کہو — رُک کیوں گئی ہو؟‘‘

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا "بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دیدیا ہے"

شنکر نے یہ سن کر کہا "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دیدوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو؟"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا "نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنوا دو"

شنکر مسکرایا "میری جیب میں اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے، بہر حال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائیگی۔ بس اب خوش ہو گئیں" سلطانہ کے بُندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا "تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بُندے ہیں زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہونگے"

اس پر شنکر نے کہا "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو، دیتی ہو"

"لے لو" یہ کہہ کر سلطانہ نے بُندے اُتار کر شنکر کو دیدیئے اس کے بعد افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اُس نے سلطانہ کو دی اور کہا "ساٹن کی شلوار ہے ۔۔ دیکھ لینا شاید لمبی ہو۔ اب میں چلتا ہوں"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اُس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اُسکی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں بال بکھرے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اُٹھا ہے اور سیدھا اِدھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا ساٹن کی کالی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی بُندوں کی اور اس سودے کا جو اُسے افسوس ہوا تھا اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے کر آئی۔ تینوں کالے کپڑے اُس نے جب پہن لیئے تو دروازہ پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی۔ اُس نے سلطانہ کے تینوں، کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا ”قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا ہے پر یہ شلوار نئی ہے۔ کب بنوائی؟“

سلطانہ نے جواب دیا ”آج ہی درزی لایا ہے“ یہ کہتے ہوئے اُس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں: ”یہ بُندے تم نے کہاں سے لیئے؟“

انوری نے جواب دیا ”آج ہی منگوائے ہیں“

اِس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

لالٹین

میرا قیام "بوٹ" میں گو مختصر تھا۔ لیکن گوناگوں روحانی مسرتوں سے پُر۔ میں نے اس کی صحت افزا میں جتنے دن گذارے ہیں انکے ہر لمحہ کی یاد میرے ذہن کا ایک جز بن کے رہ گئی ہے جو بھلائے نہ بھولے گی — کیا دن تھے — بار بار میرے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوتی ہے اور میں کئی کئی گھنٹے اس کے زیر اثر بے خود یا بے ہوش رہتا ہوں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اِنسان اپنی گذشتہ زندگی کے کھنڈروں پر مستقبل کی دیواریں استوار کرتا ہے۔ اِن دِنوں میں بھی یہی کر رہا ہوں۔ یعنی بیتے ہوئے ایام کی یاد کو اپنی مضمحل رگوں میں زندگی بخش انجکشن کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

جو کل ہوا تھا اُسے آج اگر دیکھا جائے تو اُس کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ نظر آئیگا اور جو کل ہونا ہے اُسکے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ آج سے پورے چار مہینے کی طرف دیکھا جائے بٹوت میں میری زندگی افسانہ معلوم ہوتی ہے ایسا افسانہ جس کا مسودہ صاف نہ کیا گیا ہو۔ اِس کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنا دوسرے انسانوں کی طرح میرے بس میں بھی نہیں جب میں استقبال کے آئینہ میں اپنی آنے والی زندگی کا عکس

دیکھنا چاہتا ہوں تو اس میں مجھے حال ہی کی تصویر نظر آتی ہے اور کبھی کبھی، اس تصویر کے پسِ منظر میں ماضی کے دھندلے نقوش نظر آجاتے ہیں - ان میں بعض نقش اس قدر تیکھے اور شوخ رنگ ہیں کہ شاید ہی انہیں زمانہ کا ہاتھ مکمل طور پر مٹا سکے۔

زندگی کے اس کھوئے ٹکڑے کو میں اسوقت زمانہ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں جو شریر بچے کی طرح مجھے بار بار اس کی جھلک دکھا کر اپنی پیٹھ پیچھے چھپا لیتا ہے ...... اور میں اس کھیل ہی سے خوش ہوں۔ اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔

ایسے واقعات کو جن کی یاد میرے ذہن میں ابتک تازہ ہے - میں عام طور پر دہراتا رہتا ہوں، تاکہ انکی تمام شدت برقرار رہے - اور اس غرض کے لئے میں کئی طریقے استعمال کرتا رہتا ہوں - بعض اوقات یہ بیتے ہوئے واقعات اپنے دوستوں کو سُنا کر اپنا مطلب حل کر لیتا ہوں - اگر آپ کو میرے ان دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہو تو وہ آپ سے یقیناً یہی کہیں گے کہ میں قصہ گوئی اور آپ بیتیاں سنانے کا بالکل سلیقہ نہیں رکھتا - یہ میں اس لیئے کہہ رہا ہوں کہ داستان سُنانے کے دوران میں مجھے سامعین کے تیوروں سے ہمیشہ اس بات کا احساس ہوا ہے کہ میرا بیان غیر مربوط ہے - اور میں جانتا ہوں کہ چونکہ میری داستان میں ہمواری کم اور جھٹکے زیادہ ہوتے ہیں اسلیئے میں اپنے محسوسات کو اچھی طرح کسی کے دماغ پر منتقل نہیں کر سکتا اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں ایسا شاید ہی کر سکوں - اسکی خاص وجہ یہ ہے کہ میں اکثر اوقات اپنی داستان سناتے سناتے جب ایسے مقام پر پہونچتا ہوں - جس کی یاد میرے ذہن میں موجود نہ تھی اور وہ خیالات کی رو میں خود بخود بہہ کر چلی آئی تھی تو غیر ارادی طور پر اس نئی یاد کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہوں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے بیان کا تسلسل یک لخت منتشر ہو جاتا ہے اور جب میں ان گہرائیوں سے

نکل کر داستان کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑنا چاہتا ہوں تو عجلت میں وہ ٹھیک طور سے نہیں جڑتا۔

کبھی کبھی میں یہ داستانیں رات کو سوتے وقت اپنے ذہن کی زبانی خود سنتا ہوں، لیکن...... اس میں مجھے تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے۔ میرے ذہن کی زبان بہت تیز ہے اور اسکو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات اپنی تفصیل کے ساتھ خود بخود بیان ہونا شروع ہو جاتے ہیں کہ طبیعت اُکتا جاتی ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کی یاد کسی دوسرے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے اور اس کا احساس کسی دوسرے احساس کو اپنے ساتھ لے آتا ہے اور پھر احساسات و افکار کی بارش زوروں پر شروع ہو جاتی ہے۔ اور اتنا شور مچتا ہے کہ نیند حرام ہو جاتی ہے۔ جس روز صبح کو میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آئیں آپ سمجھ لیا کریں کہ ساری رات میں اپنے ذہن کی قصہ گوئی کا شکار بنا رہا ہوں۔

جب مجھے کسی بیتے ہوئے واقعہ کو اس کی تمام شدتوں سمیت محفوظ کرنا ہوتا ہے تو میں قلم اٹھاتا ہوں اور کسی گوشے میں بیٹھ کر کاغذ پر اپنی زندگی کی اس ٹکڑے کی تصویر کھینچ دیتا ہوں۔ یہ تصویر بھدی معلوم ہوتی ہے یا خوبصورت اسکے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے ادبی نقاد میری ان قلمی تصویروں کے متعلق کیا رائے مرتب کرتے ہیں۔ دراصل مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر میری تصویر کشی سقیم اور خام ہے تو ہوا کرے مجھے اس سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ میں یہ کہانیاں صرف اسلئے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے۔ جس طرح عادی شراب خور دن ڈھلے شراب شراب کا رخ کرتا ہے ٹھیک اسی طرح انگلیاں بے اختیار قلم کی طرف بڑھتی ہیں اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔

میرا روئے سخن یا تو اپنی طرف ہوتا ہے یا ان چند افراد کی طرف جو میری تحریروں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ میں ادب سے دُور اور زندگی سے نزدیک تر ہوں۔

زندگی — زندگی — آہ زندگی!!!

میں زندگی زندگی پکارتا ہوں مگر مجھ میں زندگی کہاں؟ — اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنی عمر کی پٹاری کھول کر اُس کی ساری چیزیں باہر نکالتا ہوں اور جھاڑ پونچھ کر بڑے قرینے سے ایک قطار میں رکھتا ہوں اور اُس آدمی کی طرح جس کے گھر میں بہت تھوڑا سامان ہو ان کی نمائش کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے اپنا یہ فعل بہت بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن میں کیا کروں مجبور ہوں۔ میرے پاس اگر زیادہ نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر مجھ میں، سفلہ پن پیدا ہو گیا ہے تو اس کا ذمہ دار میں کیسے ہو سکتا ہوں۔ میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے۔ دُنیا میں ایسے بھی تو لوگ ہوں گے جن کی زندگی چٹیل میدان کی طرح خشک ہے اور میری زندگی کے ریگستان پر تو ایک بار بارش ہو چکی ہے۔

گو میرا شباب ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہے مگر میں ان دنوں کی یاد پر جی رہا ہوں۔ جب میں جوان تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سہارا بھی کسی روز جواب دے جائے گا اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا میں بتا نہیں سکتا۔ لیکن اپنے موجودہ انتشار کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا انجام چشم فلک کو نمناک کر دے گا۔ آہ خرابۂ فکر انجام!

وہ شخص جسے انجام کار اپنے وزنی افکار کے نیچے دب جانا ہے یہ سطور لکھ رہا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ایسی اور بہت سی سطریں لکھنے کی تمنّا اپنے دل میں رکھتا ہے۔

میں ہمیشہ مغموم و ملول رہا ہوں۔ لیکن یہ شبیر جانتا ہے کہ جھوٹ میں میری

آہوں کی زردی اور تپش کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار مسرت کی سُرخی اور ٹھنڈک بھی تھی۔ وہ آب و آتش کے اس باہمی ملاپ کو دیکھ کر متعجب ہوتا تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے اس کی نگاہوں میں میرے وجود کو ایک معمہ بنا دیا تھا کبھی کبھی وہ سمجھنے کی کوشش میں وہ میرے نزدیک آ جاتا بھی تھا مگر دفعتہً کوئی ایسا حادثہ وقوع پذیر ہوتا جس کے باعث اسے پھر پرے ہٹنا پڑتا تھا۔ اور اس طرح وہ نئی شدت سے مجھے پُراسرار اور کبھی پُر تصنع انسان سمجھنے لگا تھا۔

اکرام صاحب حیران تھے کہ ٹوٹ جیسی غیر آباد اور غیر دلچسپ دیہات میں پڑے رہنے سے میرا کیا مقصد ہے۔ وہ ایسا کیوں سوچتے تھے؟ اسکی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہے کہ ان کے پاس سوچنے کے لئے اور کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اسی مسئلے پر غور و فکر کرتے تھے۔

وزیر کا گھر ان کے بنگلے کے سامنے بلند پہاڑی پر تھا۔ اور جب انہوں نے اپنے نوکر کی زبانی یہ معلوم کیا کہ میں اس پہاڑی لڑکی کے ساتھ پہروں باتیں کرتا رہتا ہوں تو اُنہوں نے یہ سمجھا کہ میری دُکھتی ہوئی رگ ان کے ہاتھ آ گئی ہے، اور اُنہوں نے ایک ایسا راز معلوم کر لیا ہے جس کے افشا پر تمام دُنیا کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں گے۔ لوگوں سے وہ جب اس مسئلے پر باتیں کرتے تھے تو کہ میں تعیش پسند ہوں اور ایک بھولی بھالی لڑکی کو پھانس رہا ہوں اور ایک بار جب انہوں نے مجھ سے بات کی تو کہا "دیکھئے یہ پہاڑی لونڈیا بڑی خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اُس کے جال میں پھنس جائیں۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہوں نے یا کسی اور کو میرے معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وزیر کا کیریکٹر بہت خراب تھا اور میرا کیریکٹر بھی کوئی خاص اچھا نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ لوگ کیوں میری فکر میں مبتلا تھے اور پھر جو ان کے من میں تھا صاف صاف کیوں نہیں کہتے تھے وزیر پہ میرا کوئی حق نہ تھا۔ اور

نہ وہ میرے دباؤ میں تھی، اکرام صاحب یا کوئی صاحب اگر اس سے دوستانہ پیدا کرنا چاہتے تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ دراصل ہماری تہذیب ومعاشرت ہی کچھ اِس قسم کی ہے کہ عام طور پر صاف گوئی کو معیوب خیال کیا جاتا ہے کھُل کر بات ہی نہیں کی جاتی اور کسی کے متعلق اگر اظہار خیال کیا بھی جاتا ہے تو غلاف چڑھا کر۔

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور پہاڑی لونڈیا سے جسے بڑا خطرناک کہا جاتا، اپنی دلچسپی کا اعتراف کیا لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے دل کی آواز کو دل ہی دِل میں دبا دینے کے عادی تھے اس لئے میری سچی باتیں اُن کو بالکل جھوٹی معلوم ہوئیں اور ان کا شک بدستور قائم رہا۔

میں انھیں کیسے یقین دلاتا کہ میں اگر وزیر سے دلچسپی لیتا ہوں تو اس کا باعث یہ ہے کہ میرا ماضی و حال تاریک ہے مجھے اس سے محبت ہی نہیں تھی اس لئے میں اس سے زیادہ وابستہ تھا۔ وزیر سے میری دلچسپی اس محبت کا کارِ یہرسل تھی جو میرے دل میں اس عورت کے لئے موجود ہے جو ابھی میری زندگی میں نہیں آئی —— میری زندگی کی انگوٹھی میں وزیر ایک چھوٹا نگینہ تھی لیکن یہ نگینہ مجھے عزیز تھا۔ اس لیئے کہ اس کی تراش اس کا ماپ بالکل اس اصلی نگینہ کے مطابق تھا جس کی تلاش میں ہمیشہ میں ناکام رہا ہوں۔

وزیر سے میری دِل بستگی بے غرض نہیں تھی اسلئے میں غرضمند تھا۔ وہ شخص جو اپنے غم افزا ماحول کو کسی کے وجود سے رونق بخشنا چاہتا ہو اس سے زیادہ خود غرض اور کون ہو سکتا ہے؟ —— اس لحاظ سے میں وزیر کا ممنون بھی تھا اور خدا گواہ ہے کہ میں جب کبھی اسکو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار، میرا دل اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

شہر میں مجھے صرف ایک کام تھا —— اپنے ماضی وحال اور مستقبل کے گھُپ اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنا اور بس! —— نگر بوٹ میں

اس تاریکی کے اندر روشنی کی ایک شعاع تھی۔ وزیر کی لالٹین!

بھٹیارے کے ہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور شبیر ٹہلتے ٹہلتے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہونچ جاتے یہ بنگلہ ہوٹل سے تقریباً تین جریب کے فاصلے پر تھا۔ رات کی خنک اور نیم مرطوب ہواؤں میں اس چہل قدمی کا بہت لطف آتا تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں پہاڑیوں اور ڈھلوانوں پر مکئی کے کھیت رات کے دھندلکے میں خاکستری رنگ...... کے بڑے بڑے قالین معلوم ہوتے تھے اور جب ہوا کے جھونکے مکئی کے پودوں میں لرزش پیدا کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے بہت سی پریاں ان قالینوں پر اُتر آئی ہیں اور ہولے ناچ رہی ہیں۔

آدھا راستہ طے کرنے پر جب ہم سڑک کے بائیں طرف ایک چھوٹے سے دو منزلہ چوبی مکان کے قریب پہونچتے تو شبیر اپنی مخصوص دھن میں یہ شعر گاتا ہے ؎

ہر قدم پر فتنہ ہے قیامت ہے ؎ آسمان تیری چال کیا جانے

یہ شعر گانے کی خاص وجہ یہ تھی۔ اس چوبی مکان کے رہنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میرے اور وزیر کے تعلقات اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ٹھیک نہیں حالانکہ وہ اخلاقی معانی سے بالکل ناآشنا تھے۔ یہ لوگ مجھ سے اور شبیر سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور میری نقل و حرکت پر خاص طور پر نگرانی رکھتے تھے وہ تفریح کی غرض سے ڈلہوزی آئے ہوئے تھے اور انہیں تفریح کا کافی سامان مل گیا تھا۔ شبیر اوپر والا شعر گا کر ان کی تفریح میں اضافہ کیا کرتا تھا۔ اس کو چھیڑ چھاڑ میں خاص لطف آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی رہائش گاہ کے عین سامنے پہونچ کر اس کو یہ شعر یاد آجاتا تھا اور وہ فوراً اسے بلند آواز میں گا دیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔

یہ شعر کسی خاص واقعے یا اثر سے متعلق نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے صرف یہی شعر یاد تھا، یا ہو سکتا ہے کہ وہ صرف اسی شعر کو گا سکتا ہے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بار بار یہی شعر دہراتا۔

شروع شروع میں اندھیری راتوں میں سنسان سڑک پر ہماری چہل قدمی چوبی مکان کے چوبی ساکنوں پر (جو غیر معمولی طور اجڈ اور گنوار واقع ہوئے تھے۔) کوئی اثر پیدا نہ کر سکی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد ان کے بالائی کمرے میں روشنی نظر آنے لگی۔ اور ہماری آمد کے منتظر رہنے لگے اور جب ایک روز ان میں سے ایک نے اندھیرے میں ہمارا رُخ معلوم کرنے کے لئے بیٹری روشن کی۔ میں نے شبیر سے کہا "آج ہمارا رومان مکمل ہو گیا ہے مگر میں نے دل میں ان لوگوں کی قابل رحم حالت پر بہت افسوس کیا، کیونکہ وہ اپنے بکار دو دو تین تین گھنٹے تک جاگتے رہتے تھے۔

حسب معمول ایک حالت شبیر نے اس مکان کے پاس پہونچ کر شعر گایا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ بیٹری کی روشنی حسب معمول چمکی اور ہم باتیں کرتے ہوئے اکرام صاحب کے بنگلے کے پاس پہونچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے ہونگے، ہو کا عالم تھا، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی آسمان ہم پر مرتبان کے ڈھکنے کی طرح جھکا ہوا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہم کسی بند بوتل میں چل پھر رہے ہیں۔ سکوت اپنی آخری حد تک پہونچ کر متکلم ہو گیا تھا۔

بنگلے کے باہر برآمدے میں ایک چھوٹی سی میز پر لیمپ جل رہا تھا اور پاس پلنگ پر اکرام صاحب لیٹے ہوئے کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے شبیر نے دُور سے انکی طرف دیکھا اور دفعتہً سادھوؤں کا مخصوص نعرہ مستانہ "الکھ نرنجن" بلند کیا۔ اس غیر متوقع شور نے مجھے اور اکرام صاحب دونوں کو چونکا دیا شبیر

کھِل کھلاکر ہنس پڑا۔ پھر ہم دونوں برآمدے میں داخل ہوکر اِکرام کے پاس بیٹھ گئے۔ میرا منہ سڑک کی جانب تھا۔ عین اس وقت جب میں نے حقّہ کی نے منہ میں دبائی۔ مجھے سامنے کی سڑک کے اوپر تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر اک متحرک سایہ نظر آیا اور اس کے بعد روشنی ایک جگہ ساکن ہوگئی، میں نے خیال کیا کہ شاید وزیر کا بھائی اپنے کتّے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ چنانچہ اُدھر دیکھنا چھوڑکر میں شبیر اور اکرام صاحب کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول ہوگیا۔

دوسرے روز شبّیر کے نعرہ بُلند کرنے کے بعد پھر اخروٹ کے درخت کے عقب میں روشنی نمودار ہوئی اور سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا تیسرے رُوز بھی ایسا ہوا۔ چوتھے روز صبح کو میں اور شبیر چشمے پر غسل کو جارہے تھے کہ اوپر سے ایک کنکر گرا، میں نے اور شبیر نے بیک وقت سڑک کے اوپر جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ وزیر سر پہ پانی کا گھڑا اٹھائے ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی اور شبّیر سے کہنے لگی "کیوں جناب یہ آپ نے کیا وطیرہ اختیار کیا ہے کہ ہر روز ہماری نیند خراب کریں"

شبّیر حیرت زدہ ہوکر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں وزیر کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

شبیر نے اس سے کہا "آج آپ پہیلیوں میں بات کررہی ہیں"

وزیر نے سر پر گھڑے کا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں اتنی اتنی دیر تک لالٹین جلاکر اخروٹ کے نیچے بیٹھی رہتی ہوں اور آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ چھوٹے منہ سے شکریہ ہی ادا کریں۔ بھلا آپ کی جوتی کو غرض پڑی کیا ہے...... یہ چوکیداری تو میرے ہی ذمہ ہے ..... آپ ٹہلنے کو نکلیں اور اکرام صاحب کے بنگلے میں گھنٹوں باتیں کرتے رہیں اور میں

سامنے لالٹین لئے اونگھتی رہوں ۔"

شبیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ بھئی میں تو کچھ نہ سمجھا یہ کس دھن میں الاپ رہی ہیں ؟"

میں نے شبیر کو جواب نہ دیا اور وزیر سے کہا "ہم کئی دنوں سے رات گئے اکرام صاحب کے یہاں آتے ہیں۔ دو تین مرتبہ میں نے اخروٹ کے پیچھے تمہاری لال ٹین دیکھی، پر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم خاص ہمارے لئے تو آتی ہو...... اس کی کیا ضرورت ہے...... تم ناحق اپنی نیند کیوں خراب کرتی ہو"

وزیر نے شبیر کو مخاطب کر کے کہا "آپ کے دوست بڑے ہی ناشکرے ہیں، ایک تو میں اُن کی حفاظت کروں اور اوپر سے یہی مجھ پر اپنا احسان جتائیں۔ اُن کو اپنی جان پیاری نہ ہو پر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بات کا رُخ یوں بدل دیا "آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں انکے بہت دشمن پیدا ہو گئے ہیں پھر آپ انہیں کیوں نہیں سمجھاتے کہ رات کو باہر نہ نکلا کریں"۔

وزیر کو واقعی میری بہت فکر تھی۔ بعض اوقات وہ مجھے بالکل بچہ سمجھ کر میری حفاظت کی تدبیریں سوچا کرتی تھی، جیسے وہ خود محفوظ و مامون ہے اور میں بہت سی بلاؤں میں گھرا ہوا ہوں۔ میں نے اسے کبھی نہ ٹوکا تھا اس لئے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس شغل سے باز رکھوں جس سے وہ لُطف اٹھاتی ہے، اس کی اور میری حالت بعینہٖ ایک جیسی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی منزل کی طرف جانے والے مسافر تھے جو ایک لق و دق صحرا میں ایک دوسرے سے مل گئے تھے اسے میری ضرورت تھی اور مجھے اس کی تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح کٹ سکے میرا اور اس کا صرف یہ رشتہ تھا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ہم ہر شب مقررہ وقت پر ٹہلنے کو نکلتے شبیر چوبی مکان کے پاس پہنچ کر گاتا۔ پھر اکرام صاحب کے بنگلے سے کچھ دور کھڑے ہو کر نعرہ تکبیر کرتا۔

وزیر لال ٹین روشن کرتی اور اس کی روشنی کو ہوا میں لہرا کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ جاتی۔ شبیر اکرام سے باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتے اور میں لال ٹین کی روشنی میں اس روشنی کے ذرّے ڈھونڈتا رہتا جس سے میری زندگی منور ہو سکتی تھی۔ وزیر جھاڑیوں کے پیچھے نہ جانے بیٹھی کیا سوچتی رہتی؟

انتظار

(گھڑی آٹھ بجاتی ہے)

منتظر- آدھا گھنٹہ — صرف آدھا گھنٹہ اور پھر اسکے بعد..... یہ ٹن کی آخری ڈوبتی ہوئی گونج کتنی پیاری تھی — اور..... اور.......

منتظر کا منطقی وجود....... اگر وہ نہ آئی — یعنی اگر......

منتظر:- کیوں نہ آئے گی — ضرور آئے گی (پھیکی ہنسی)...... یہ اندیشے بالکل فضول ہیں (اپنے آپ کو تسلی دینے کے انداز میں) اُس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے

منطقی وجود- وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا۔

منتظر- کتنا لغو خیال ہے کسی کے شعر کا ایک مصرعہ ہے شاید، لیکن کسی قدر امیانہ ہے - ایسی شاعری ہی نے تو........ وہ ضرور آئے گی اور شاعری... .... شاعری اچھی چیز ہے — تپائی پر جو یہ گلدان پڑا ہے میں نے اس میں ابھی تک پھول کیوں نہ سجائے (پھولدان اٹھاتا ہے)...... یہ پھولدان اسے پسند ہے آج وہ اُسے اور بھی پسند کرے گی - نرگس اور بنفشہ کے پھول اُسے بہت بھاتے ہیں..... یہاں پر یہ ٹھیک رہے گا - کیوں (پھولدان پھر وہیں رکھ دیتا ہے - سیٹی بجاتا ہے)

منطقی وجود:- (اسی دھن میں یہ شعر گاتا ہے)

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ٭ کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

(وقفہ)

منتظر:- (ایک ایک تلفظ کر کے) وہ — آئیں — گھر — میں — ہمارے — خدا کی — قدرت — ہے — خدا کی قدرت ہے (چونک کر) خدا کی قدرت۔۔ خدا کی قدرت۔ یعنی اُس کا آنا بالکل اچانک تھا شاعر کو اس کی آمد کا یقین نہیں تھا۔ جبھی ہو گا مگر ہمیں تو پورا پورا یقین ہے کیوں؟۔

منطقی وجود:-۔۔۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔

منتظر:- ہٹاؤ جی اس خیال کو — ہاں — تو میں کیا سوچ رہا تھا۔ سوچ کیا رہا تھا؟ — سوچنے کی بات ہی کیا ہے؟ وہ ضرور آئے گی — چند منٹوں کی بات ہے۔

منطقی وجود — ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ ہوتے ہیں — ساٹھ

منتظر:- ستائیس منٹ اور رہ گئے ہیں — صرف ستائیس — (گھڑی کی ٹک ٹک بلند ہو کر پھر اصلی حالت پر آ جاتی ہے۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے پھولدان بھی سج گیا سگریٹ سلگا لیتا ہوں (ایک سگریٹ) کم از کم دس منٹ جلتا رہے گا۔

منطقی وجود:- ساڑھے سات منٹ۔

منتظر:- تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ سگریٹ سلگاتا ہے)

منطقی وجود:- کش زور سے کیوں لے رہے ہو۔

منتظر:- ساتھ ساتھ ٹہلتا بھی رہوں تو ٹھیک رہے گا (ٹہلتا ہے) ہاں — تو یہ بات ہے۔

منطقی وجود:- کیا بات ہے۔ تم کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟

منتظر :- کوئی بات نہیں، بات کیا ہوگی - ایک صرف اتنا ڈر ہے کہ.......

منطقی وجود :- موسم خراب ہے -

(کڑک سی بلند ہوتی ہے)

منتظر :- (گھبرا کر) یہ بجلی کی کڑک تو نہیں ہے -

منطقی وجود :- سگرٹوں کا ڈبہ جو آپ نے ابھی کھولا تھا اُس کا ڈھکنا آپ کے پیر کے نیچے آگیا ہے -

منتظر :- (ہنستا ہے) آواز بالکل بجلی کی سی پیدا ہوئی..... کیا ڈھکنا ہی تھا؟ ڈھکنا ہی تھا — کھڑکی کھولتا ہے) موسم زیادہ خراب تو نہیں ہے - بادل؟ — وہ اب تو گھر سے چل پڑی ہوگی - یہ سگریٹ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا - انگلیوں میں سلگ گیا ہے -

منطقی وجود :- دوسرا سلگا لوں - یوں تھوڑا سا وقت بھی خرچ ہو جائے گا -

منتظر :- نہیں زیادہ سگریٹ میں نہیں پیوں گا، منہ سے بُو آئے گی - بہت ممکن ہے اُسے ناگوار معلوم ہو - اُس نے ایکبار کہا بھی تو تھا.....

وہ :- (یعنی جس کا انتظار کیا جارہا ہے، اُس کی آواز آتی ہے) تمہیں میری ہی جان کی قسم جو اب سے سگریٹ پیئو.......

منتظر :- مجھے عادل حکمی نہیں کرنی چاہیے -   (وقفہ)

منطقی وجود :- سگریٹ بجھا دیا - اب یہ وقت کیسے کٹے گا -

منتظر :- یہ گراموفون باجا — ریکارڈ نکال کر باہر رکھ دوں، بہت ممکن ہے وہ بجانا چاہے -

منطقی وجود :- ایک ریکارڈ پورے تین منٹ تک بجتا رہے گا -

منتظر :- تین منٹ..... (ریکارڈ لگاتا ہے) .....تین منٹ تک بجتا رہے گا - کیا بُرا

ہے موسیقی مجھے پسند ہے۔

(ریکارڈ بجاتا ہے)

رات کٹی گن گن کے تارے

(ریکارڈ پر سے ایکدم سوئی ہٹا لیتا ہے)

منتظر:۔ کیا واہیات ریکارڈ ہے۔ رات کٹی گن گن کے تارے

منطقی وجود:۔ ابھی تو آٹھ بجکر کچھ منٹ ہوئے ہیں۔ ساری رات پڑی ہے۔

منتظر:۔ ابھی آٹھ بجکر کچھ منٹ ہوئے ہی ہیں۔ تو اس کا کیا مطلب ہے۔ میں — میں اتنا بے تاب کیوں ہو رہا ہوں — آجائے گی — ایسی باتوں ہی سے تو ان لوگوں کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے — میں اُس کا انتظار بالکل نہیں کروں گا — کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں میز پر یہ سفید کاغذ ہی رکھا ہے اس پر اس مہینے کا حساب لکھنا شروع کردیتا ہوں — ہاں — سگریٹ پانچ روپے...... سگریٹ پانچ روپے..... یہ آواز فیڈ ہوتی جاتی ہے اور جسکا انتظار کیا جارہا ہے اُسکی آواز اُبھرتی آتی ہے)

وہ:۔ تمہیں میری جان کی قسم جو اب سے سگریٹ پیئے — دیکھو تو کتنے کمزور ہو رہے ہو — بادام کھایا کرو۔

منتظر:۔ اسے میرا کتنا خیال ہے...... اب بھی آجائے مگر......

منطقی وجود:۔ ساڑھے آٹھ بجنے میں ابھی کافی دیر ہے۔

منتظر:۔ میں سمجھتا ہوں یہ گھڑی فاسٹ ہے — کیا پتہ ہے کہ......

منطقی وجود:۔ گھڑی سلو ہو۔

منتظر:۔ اجی نہیں، اس گھڑی کا وقت بالکل صحیح ہے ابھی پرسوں ہی ٹھیک کرائی ہے — وقفہ، کہیں اُس کی گھڑی میں فرق نہ ہو۔

منطقی وجود :- ایسا ہو سکتا ہے۔
منتظر :- تو یہ کوئی بڑی بات نہیں — پانچ نہیں دس منٹ کا فرق ہو گا۔
منطقی وجود :- اس وقت سے لیکر اب تک دس منٹ مشکل سے گذرے ہیں ابھی دس منٹ نہیں گذرے۔
منتظر :- گھڑی میں ضرور خرابی ہے — کھول کر نہ دیکھ لوں۔
منطقی وجود :- کھول کر آپ کو کیا نظر آجائے گا۔
منتظر :- کچھ نہیں، میں نے تو یہ کہا تھا کہ چلو یوں تھوڑا سا وقت گذر جائے گا۔
منطقی وجود :- تو چلئے پرزے کھول کر بیٹھ جائیے۔ مگر یاد رہے اس دن کی طرح پھر جڑیں گے نہیں۔
منتظر :- (ہنستا ہے) کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں (ہنستا ہے پھر گاتا ہے) کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں — نہیں وزن ٹھیک نہیں ہے۔
منطقی وجود :- یہ آپ کو شاعری کیا سوجھی؟
منتظر :- (خوب ہنستا ہے) یہ شاعری بھی اچھی رہی — اب بھی آجائے۔ وقت کیا ہوا ہے — ساڑھے ......
منطقی :- ابھی ساڑھے کہاں — سوا کہیئے۔ سوا۔
منتظر :- مجھے کوئی کام بھی نہیں ہے آج۔
منطقی :- اس مہینے کا حساب لکھنا تھا۔
منتظر :- اجی لعنت بھیجو حساب کتاب پر۔ یہ بھی کوئی وقت ہے حساب کتاب کا لیکن ایسے وقت میں کرنا کیا چاہیئے۔
منطقی :- اس کو ایک خط لکھنا شروع کرو۔
منتظر :- بالکل ٹھیک — وقفہ) — اس پیڈ کا کاغذ اچھا رہے گا

منطقی :- ہاں - خوشبودار ہے -

منتظر :- کیا لکھوں ـــــ (وقفہ) ـــــ مضمون سمجھ میں نہیں آتا -

منطقی :- لکھو - میں تمہارا بہت انتظار کرتا رہا -

منتظر :- اور جب وہ آئے تو یہ خط اُس کو دے دوں ـــــ خیال اچھا ہے ـــــ تو لکھتا ہوں ـــــ (وقفہ) .... میرا خیال ہے کہ اب وہ گھر سے چل پڑی ہوگی ـــــ یہ خط اُس کے آنے تک ختم نہ ہو گا -

منطقی :- تم خط لکھنا تو شروع کرو -

منتظر :- میری پیاری .... تم نے آج وعدہ کیا تھا کہ ساڑھے آٹھ بجے آؤں گی - میں تمہارا شدت کے ساتھ انتظار کرتا رہا ....

منطقی :- کتنی پھُس پھُسی عبارت ہے -

منتظر :- پھُس پھُسی ـــــ نہیں تو ـــــ (وقفہ) ـــــ واقعی پھُس پھُسی ہے - اب تو وہ آتی ہی ہو گی - (کاغذ پھاڑ دیتا ہے) خط کی کوئی ضرورت نہیں میں اس کو زبانی بتا دوں گا -

منطقی :- بشرطیکہ وہ آجائے

منتظر :- یہ کیسی شرط - وہ ضرور آئے گی -

منطقی وجود :- اگر ...... اگر ....

منتظر :- نہیں - نہیں

منطقی :- ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے -

منتظر :- کیسے بیہودہ خیال ہیں -

منطقی :- اگر وہ نہ آئی تو -

منتظر :- ضرور آئے گی -

منطقی :۔ دیکھ لیں گے۔

(دستک کی آواز)

منتظر :۔ (خوش ہو کر .... لو وہ آگئی۔ (گھبرا کر) سب چیزیں ٹھیک ہیں، نا ہے ___ سگرٹوں کا ڈبہ ہے؟ ___ اسے کہاں رکھوں؟ ___ کون ہے؟ اِس کا ڈھکنا ہے کہاں؟ ___ لعنت! ___ خالی ہی کہیں چھپا دیتا ہوں ___ اور ___ اور یہ آیا ___ بس اب سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

منطقی :۔ اپنا دم تو دُرست کر لو۔ ہانپ رہے ہو۔

منتظر :۔ دم دم سب ٹھیک ہے ___ میرا خیال ہے اسکو ڈرنا چاہیئے۔

(دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم ڈرانے کی خاطر ہپ کرتا ہے۔)

اخبار والا :۔ (ڈرے ہوئے انداز میں) ..... اجی صاحب آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ اُف

منتظر :۔ تم ___ ت ___ و ___ تم ___ تم کون ہو۔ تم اخبار والے کیوں ہو؟ ___ بھاگ جاؤ یہاں سے۔

اخبار والا :۔ حضور یہ پوچھنے آیا تھا کہ دونوں اخبار اسٹیٹسمین اور ہندوستان ٹائمز لایا کروں یا اکیلا اسٹیٹسمین ___ جیسا آپ حکم دیں۔

منتظر :۔ جتنے بھی ہوں لے آیا کرو۔

اخبار والا :۔ بہت اچھا سرکار۔

(اخبار والا چلا جاتا ہے۔ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔)

منتظر :۔ اس اخبار والے کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ کمبخت ڈر گیا تھا۔ (ہنستا ہے)

(ہولے ہولے دستک دینے کی آواز)

منتظر :۔ (ہنسی روک کر) آگئی ___ آگئی ___

(دروازہ کھولتی ہے اور پھر وہ "ہپ" کرتا ہے)

اخبار والا:۔ (ڈرے انداز میں) صاحب ۔ یہ ۔ یہ ۔ آپ بار بار مجھے کیوں ڈراتے ہیں۔

منتظر:۔ اوہ! ۔ تم کیا چاہتے ہو؟ اب پھر کیوں آئے ہو؟ ۔ خدا کے لیے جاؤ۔

اخبار والا:۔ صاحب یہ پوچھنے آیا تھا کہ اردو کے اخبار بھی لے آیا کروں۔

منتظر:۔ فارسی، عربی، گجراتی، مرہٹی پنجابی سب زبانوں کے لے آیا کرو مگر خدا کے لیے اس وقت جاؤ۔

(دروازہ بند کر دیتا ہے۔)

منتظر:۔ حد ہو گئی ہے۔

منطقی وجود:۔ بڑے شرم کی بات ہے ۔ وہ دل میں کیا کہتا ہوگا۔

منتظر:۔ اجی ہٹاؤ ۔ لیکن میں کہتا ہوں وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں کہیں ایسا تو نہیں ہو گیا......

منطقی وجود:۔ کہ وہ بھول گئی ہو۔

منتظر:۔ ایسا بھلا ہو سکتا ہے۔ بس اب وہ آتی ہی ہوگی۔ یہاں سے اس کا گھر بھی تو کافی دور ہے۔ اور بہت ممکن ہے پیدل آئے۔

منطقی:۔ تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ بہت دیر بعد آئے گی۔

منتظر:۔ میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ وہ گھر سے تو بہت پہلے چل پڑی ہوگی گھڑی ۔ گھڑی ۔ یہ گھڑی ضرور خراب ہو گئی ہے۔ دیکھو نا اس کی سیکنڈ کی سوئی کتنی ہولے ہولے چلتی ہے۔

منطقی:۔ سامنے کلاک موجود ہے۔

منتظر :- دونوں کا وقت مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتا - خیر کل پتا لگ جائے گا -
ابھی تک دس منٹ باقی ہیں ــــ گذر گئے چکے ہیں -
منطقی :- سترہ ــــ تیرہ ابھی باقی ہیں -
منتظر :- میں دیوانہ ہو جاؤں گا -
منطقی :- کیا کہا -
منتظر :- کچھ بھی نہیں ــــ تو یہ ناول پڑھنا شروع کر دیتا ہوں -

(لکڑی کے ساتھ کوئی چیز ٹکراتی ہے)

منتظر :- (اوچھل کر) ...... وہ آگئی ــــ آیا -
منطقی :- آپ کا پیر کرسی کے نچلے ڈنڈے کے ساتھ ٹکرایا ہے دستک نہیں ہوئی -
منتظر :- پھر ٹکرائے گا ــــ اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں ــــ ٹہلتا رہوں گا اور پڑھتا رہوں گا -

(بے قراری کے ساتھ ٹہلتا ہے - گھڑی کی ٹک ٹک کی رفتار مدھم ہوتی جاتی ہے - مگر آواز بلند ہوتی جاتی ہے)

منتظر :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا عجب اوٹ پٹانگ عبارت ہے - (کتاب بند کرنے اور میز پر رکھنے کی آواز) ...... پھر پڑھوں گا -
منطقی وجود :- دِل بیٹھا کیوں جا رہا ہے -
منتظر :- کیا معلوم - پانی پیتا ہوں (پانی پیتا ہے) ...... تلخی ــــ کس قدر تلخی ہے حلق میں ــــ میرا خیال ہے کہ ٹھیک وقت پر آئے گی پورے ساڑھے آٹھ بجے (چونک کر) ابھی ساڑھے آٹھ نہیں بجے ــــ میں ...... میں بیٹھ جاتا ہوں گھڑی بڑے بڑے وقفوں کے بعد ٹک ٹک کرتی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیکنڈ لمبے ہو گئے ہیں) مجھے کچھ ہو گیا ہے -

منطقی وجود:۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

منتظر:۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ (میز پر انگلیوں سے ڈھول بجاتا ہے) یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ (گھڑی کی بھیانک آواز)

(اُٹھ کر اضطراب کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیتا ہے۔)

منطقی وجود:۔ پیر لڑکھڑا رہے ہیں

منتظر:۔ تو اچھا بھلا بیٹھا تو تھا —— اُٹھ کر چلنے کیوں لگا۔ حلق سوکھ رہا ہے۔ لیکن اب تو اُس کے آنے میں کوئی دیر نہیں۔ چند منٹوں کی......

منطقی وجود:۔ چند منٹوں کی جن ہیں...... (گھڑی لمبے لمبے سانس لیتی ہے)

(کاغذ کھڑکھڑاتا ہے)

منتظر:۔ آج ہوا کتنی تیز ہے۔ کیلنڈر کا کاغذ کھڑکھڑا رہا ہے

(برتن گرنے کی آواز)

منتظر:۔ اس میری ہمسائی کے گھر میں ہر وقت برتن ہی گرتے رہتے ہیں)

منطقی:۔ آج تمہارے کان بڑے تیز ہیں۔

فریب آرزو کی سہل انکاری نہیں جاتی ؎ ہم اپنے دِل کی دھڑکن کو تیری آوازِ پا سمجھے

منتظر:۔ ہم اپنے دِل کی دھڑکن کو تیری آوازِ پا سمجھے —— آوازِ پا —— دِل کی دھڑکن...... (گھڑی زیادہ لمبے لمبے سانس لیتی ہے)...... یہ میرے دِل کو کچھ ہو گیا ہے یا کلاک خراب ہو گیا ہے۔ میرا حلق بھی سوکھ رہا ہے..... ابھی وقت نہیں ہوا۔ (اضطراب کے ساتھ ٹہلتا ہے)

(دروازے پر دستک)

منتظر:۔ (کمزور آواز میں)..... آ گئی —— آ گئی —— خوشی سے میری آواز ہی نہیں نکلتی —— دروازہ .... دروازہ ....

منطقی :- دروازہ آپ کے سامنے ہے۔
منتظر :- ارے ہاں .... آیا...... آیا
(دروازہ کھولنے کی آواز)
دوست :- السلام علیکم
منتظر :- (ہکلا کر) وو وو — وعلیکم السلام۔ ک۔ ک۔ ک۔ کیسے تشریف لائے۔
دوست :- میں تم کو کچھ اِس گھوڑی کے بابت بتانے آیا تھا۔
منتظر :- گھو۔ گھو۔ گھوڑی۔
دوست :- ہاں وہی جس کی بابت کل کہتا تھا کہ بڑی دولتیاں جھاڑتی ہے۔ بھئی تھی بڑی منہ زور — بڑی ٹھیں چھپنے دیتی تھی۔ بگدھریاں کرتی تھی بگدھریاں۔
منتظر :- بگ — دھریاں — جی
دوست :- منہ کی بہت کڑی تھی۔ الف ہو جاتی تھی الف۔
منتظر :- جی کسی سلوتری کے حوالے کر دی ہوتی۔
دوست :- تم تو گھاس کھا گئے ہو — کہاں کا سوار کہاں کا سلوتری قدم رکاب میں گیا اور ریگٹ ہو گئی — اور مجھے تو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی تھی۔ ایسی چمکتی تھی جیسے بجلی.....
منتظر :- میں...... میں......
دوست :- کاٹھیاواڑ کھیت کی تھی نا — چھوٹے تو سرپٹ جائے انجر پنجر ڈھیلے کر دے......
منتظر :- میں...... میں......
دوست :- یہ میں میں کیا کرتے ہو۔

منتظر:- میں بیمار ہوں ___ سخت بیمار ہوں — آپ — آپ — اوہ — ساڑھے آٹھ بجنے والے ہیں۔

دوست:- (فکر مند لہجے میں) تم بیمار ہو — لیکن بھئی عجیب بیوقوف ہو۔ مجھ سے تم نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اب اطمینان سے سارا حال سناؤ مجھے کوئی خدمت بتاؤ بھی واللہ کمال کر دیا — اور ہاں، یہ ساڑھے آٹھ بجے تم نے کیا کہا تھا۔

منتظر:- (مردہ آواز میں) ساڑھے آٹھ بجے — ساڑھے آٹھ بجے مجھے دوا پینی ہے۔

دوست:- دوست لاؤ میں پلا دیتا ہوں ___ کہاں دوا ___ ساڑھے آٹھ بجنے میں اب کونسی دیر ہے — دوا کہاں ہے؟

منتظر:- نہیں نہیں۔ میں خود پی لوں گا ___ آپ تکلیف نہ کریں — آپ، — آپ — آپ جائیے۔

دوست:- میں تمہیں یہاں بیمار چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔

منتظر:- میں — میں — میں بیمار نہیں ہوں ___ میں ابھی ٹھیک ہو جاؤنگا۔ آپ جائیے — اوہ خدا کے لئے آپ جائیے۔ مجھے دل کا دورہ پڑ جائیگا۔

دوست:- دل کا دورہ ___ بھئی اب تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ بتاؤ دوا کہاں ہے؟

منتظر:- دوا میرے پاس نہیں ہے۔ آپ جائیے۔ خدا کے لئے جائیے۔

دوست:- تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر میں ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جا سکتا۔

منتظر:- کیا کہا؟ — (اضطراب بڑھتا جاتا ہے گھڑی کی آواز زیادہ لمبے لمبے سانس لیتی ہے) کیا کہا؟ — آپ ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جائیں گے ___ میں ___ میں مر جاؤں گا — خدا کے لئے ڈاکٹر کے پاس دوڑیئے جائیے ___ میری حالت بہت خراب ہے ___ میری۔ حالت۔ بہت۔ نازک ہے۔ جائیے ___ (آواز کمزور ہو جاتی ہے۔)

دوسرت :- غش طاری ہوگیا — کیا ہوا؟ — ڈاکٹر؟ — کہاں ملے گا — ڈاکٹر (گھبراہٹ کے عالم میں دوڑتا جاتا ہے) اب کوئی ڈاکٹر مل جائے - اس وقت (چلا جاتا ہے)

(گھڑی اصلی حالت میں ٹِک ٹِک کرتی ہے۔ یہ آواز ڈیڑھ سیکنڈ تک جاری رہتی ہے۔ آخر میں کلاک میں خرخراہٹ پیدا ہوتی ہے اور ایک ٹن کی آواز آتی ہے۔ اِس ٹن کی گونج تھوڑی دیر قائم رہتی ہے پھر گھڑی کی ٹِک ٹِک بالکل بند ہو جاتی ہے۔ اور ایک سیکنڈ تک مکمل خاموشی طاری رہتی ہے — اس خاموشی کے بعد دروازہ کھلتا ہے اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ وہ آتی ہے۔

وہ :- دیکھو تو کس مزے سے جناب سو رہے ہیں۔ گویا اُن کو معلوم ہی نہیں میں آ رہی ہوں — کافی گہری نیند سو رہے ہیں — خدا جانے کہاں سے گھومتے گھامتے تھک کر آئے ہونگے — (خفگی کے ساتھ) تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ یہاں بن بلائے مہمانوں کی طرح کھڑی رہوں ......

(دروازہ بند کر کے چلی جاتی ہے۔)

پھولوں کی سازش

باغ میں جتنے پھول تھے۔ سب کے سب باغی ہو گئے۔ گلاب کے سینے میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اسکی ایک ایک رگ آتشیں کے جذبہ کے تحت بھڑک رہی تھی۔ ایک روز اس نے اپنی کانٹوں بھری گردن اٹھائی اور غور و فکر کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا:۔

"کسی کو کوئی حق حاصل نہیں کہ ہمارے پسینے سے اپنے عیش کا سامان مہیا کرے —— ہماری زندگی کی بہاریں ہمارے لئے ہیں اور ہم اس میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کر سکتے!"

گلاب کا منہ غصہ سے لال ہو رہا تھا۔ اسکی پنکھڑیاں تھرتھرا رہی تھیں چنبیلی کی جھاڑی میں تمام کلیاں یہ شور سن کر جاگ اٹھیں اور حیرت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ گلاب کی مردار آواز پھر بلند ہوئی۔

"ہر ذی روح کو اپنے حقوق کی نگرانی کا حق حاصل ہے اور ہم پھول اس سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ ہمارے قلوب زیادہ ...... نازک اور حساس ہیں۔ گرم ہوا کا ایک جھونکا ہماری دنیائے رنگ و بو کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے اور شبنم کا ایک بے مقدار قطرہ ہماری پیاس بجھا سکتا ہے۔ کیا ہم اس کالے مالی کے کھردرے ہاتھوں کو برداشت کر سکتے ہیں۔ جس پر موسموں کے تغیر و تبدل کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا؟"

موتیا کے پھول چلائے ہرگز نہیں۔" لالہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور کہنے لگا اس کے ظلم سے میرا سینہ داغدار ہو رہا ہے۔ میں پہلا پھول ہوں گا۔ جو اس جلاد کے خلاف بغاوت کا سُرخ جھنڈا بلند کرے گا۔"

یہ کہہ کر وہ غصّہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔

چنبیلی کی کلیاں متحیر تھیں کہ شور کیوں بلند ہو رہا ہے۔ ایک کلی ناز کے ساتھ گلاب کے پودے کی طرف جھکی اور کہنے لگی "تم نے میری نیند خراب کر دی۔ ہے آخر گلا پھلا پھلا کر چلا رہے ہو؟"

گلنجر دجو دور کھڑا گلاب کی قائدانہ تقریر پر غور کر رہا تھا بولا "قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے۔ گو ہم ناتواں پھول ہیں لیکن اگر ہم سب مل جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی جان کے دشمن کو پیس کر نہ رکھدیں۔ ہماری پتیاں اگر خوشبو کر پیدا کرتی ہیں تو زہریلی گیس بھی تیار کر سکتی ہیں —— بھائیو! گلاب کا ساتھ دو اور اپنی فتح سمجھو۔"

یہ کہکر اُس نے اخوۃ کے جذبے کے ساتھ ہر پھول کی طرف دیکھا۔

گلاب کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چنبیلی کی کلی نے اپنے مرمریں جسم پر ایک تھرتھری پیدا کرتے ہوئے کہا "یہ سب بے کار باتیں ہیں.... آؤ تم مجھے شعر سناؤ، میں آج تمہاری گود میں سونا چاہتی ہوں...... تم شاعر ہو، میرے پیارے آؤ ہم بہار کے اِن خوشگوار دنوں کو ایسی فضول باتوں میں ضائع نہ کریں اور اُس دنیا میں چلیں جہاں نیند ہی نیند ہے.... میٹھی اور راحت بخش نیند!"

گلاب کے سینے میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اس کی نبض کی دھڑکن تیز ہو گئی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی اتھاہ گہرائی میں اُتر رہا ہے۔

اُس نے کلی کی گفتگو کے اثر کو دُور کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا "نہیں میں میدانِ جنگ میں اترنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ اب یہ تمام رومان میرے لئے نہیں ہیں۔"

کلی نے اپنے لچکیلے جسم کو بل دے کر خوب گول لہجہ میں کہا: "آہ میرے پیارے گلاب ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے وحشت ہوتی ہے....... چاندنی راتوں کا خیال کرو....... جب میں اپنا لباس اتار کر اس نورانی فوارے کے نیچے نہاؤنگی تو تمہارے گالوں پر سرخی کا اُتار چڑھاؤ مجھے کتنا پیارا معلوم ہوگا اور تم میرے لب کس طرح دیوانہ وار چومو گے...... چھوڑو ان فضول باتوں کو میں تمہارے کاندھے پر سر رکھ کر سونا چاہتی ہوں۔"

اور چنبیلی کی نازک ادا کلی گلاب کے تھراتے ہوئے گال کے ساتھ لگ کر سو گئی ــــ گلاب مدہوش ہو گیا۔ چاروں طرف سے ایک عرصہ تک دوسرے پھولوں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں مگر گلاب نہ جاگا...... ساری رات وہ مخمور رہا۔

صبح کا نا مالی آیا اُس نے گلاب کے پھول کی ٹہنی کے ساتھ چنبیلی کی کلی چمٹی ہوئی پائی اُس نے اپنا کھُردرا ہاتھ بڑھایا اور دونوں کو توڑ لیا...

گرم سُوٹ

گنڈا سنگھ نے چونکہ ایک زمانے سے اپنے کپڑے تبدیل نہیں کئے تھے اس لئے پسینے کے باعث ان میں ایک عجیب قسم کی بُو پیدا ہو گئی تھی جو زیادہ شدت اختیار کرنے پر اب گنڈا سنگھ کو کبھی کبھی اداس کر دیتی تھی۔ اسکو یہ بو نے کبھی اتنا تنگ نہیں کیا تھا جتنا کہ اب اس گرم سوٹ نے اُسے تنگ کر رکھا تھا۔

اپنے کسی دوست کے کہنے پر وہ امرتسر چھوڑ کر دہلی چلا آیا تھا۔ جب اُس نے امرتسر کو خیرباد کہا تو گرمیوں کا آغاز تھا، لیکن ابکے گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی، گنڈا سنگھ کو یہ گرم سوٹ بہت ستا رہا تھا۔

اُس کے پاس صرف کپڑے تھے۔ گرم پتلون، گرم کوٹ، گرم، واسکٹ اور ایک سوتی قمیص یہ گرم سوٹ اِسے اِس لئے دہلی کی شدید گرمیوں میں پہننا پڑتا تھا کہ اُسکے پاس اور کوئی کپڑا ہی نہیں تھا اور سوٹ کے ساتھ واسکٹ اسے اس لئے پہننا پڑتی تھی کہ اُس کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ اُسے احتیاط یا بداحتیاطی سے رکھ سکتا یوں تو وہ اس واسکٹ کو یا کوٹ کو ہی دریبہ کلاں میں اپنے دوست کی دوکان میں رکھ دیتا مگر وہاں اُس نے پہلے روز ہی کئی چوہے دیکھے تھے۔ دہلی آنے کے دوسرے روز چاندنی چوک میں اُس نے دس گلے کھائے تھے۔ ان کا شیرہ جا بجا کوٹ اور واسکٹ پر گر پڑا تھا۔ اگر وہ یہ دونوں چیزیں اُس

دُکان میں رکھ دینا تو ظاہر ہے کہ جہاں جہاں شیرہ گرا تھا چوہے کپڑا کتر جاتے اور گنڈا سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سُوٹ جو اُسے ستمبر ۱۹۳۹ء یعنی اِس جنگ کے ابتدائی روز ملا تھا۔ یوں بے کار چوہوں کی نذر ہو جائے۔ اِس سوٹ کے ساتھ اتفاقیہ طور پر ایک ایسا دن منسوب ہو گیا تھا جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

گنڈا سنگھ کو چنانچہ اِس لئے بھی اپنا سوٹ عزیز تھا۔ امرتسر میں جب اُس نے اپنا یہ تاریخی سوٹ پہنا تھا تو دربار صاحب کے آس پاس اُسکے جتنے ہاتھی دانت کا کام کرنے والے دوست رہتے تھے متحیر ہو گئے تھے۔ بلبیر نے جب اُسے بازار میں دیکھا تو متحرک خراد کو روک کر زور سے آواز دی تھی "گنڈا سیاں گنڈا سیاں ذرا اِدھر تو آ — یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

گنڈا سنگھ لباس کے معاملے میں از حد بے پروا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اپنے لباس کی طرف اُس نے کبھی توجہ ہی نہ دی تھی وہ پتلون اِسی طرح پہنا کرتا تھا جسطرح کچھ پہنی جاتی ہے یعنی کسی تکلف کے بغیر۔ اُس کے متعلق اُس کے دوستوں میں یہ بات عام مشہور تھی کہ اگر تن ڈھکنا ضروری نہ ہوتا تو گنڈا سنگھ بالکل ننگا رہتا۔

چھ چھ مہینے تک وہ نہاتا نہیں تھا بعض اوقات اُس کے پیروں پر اس قدر میل جم جاتا تھا کہ اور میل جمنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ دُور سے اگر آپ اُس کے میلے پیروں کو دیکھتے تو یہی معلوم ہوتا کہ گنڈا سنگھ نے موزے پہن رکھے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی غلاظت پسندی کی انتہا یہ تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ منہ ہاتھ دھوئے بغیر کرتا تھا اور سردیوں میں ایک ایسا لحاف اوڑھ کر سوتا تھا کہ اگر کوئی اسے کوڑے پر پھینک دے تو صبح جب بھنگی کوڑا کرکٹ اٹھانے آتا تو یہ لحاف دیکھ کر اسکو بھی گھن آ جاتی پر لطف یہ ہے کہ اُسکی ان تمام غلاظتوں کے باوجود لوگ اس سے محبت کرتے تھے اور امرتسر میں، تو آپ کو ایسے کئی آدمی مل جائیں گے جو اُسکی محبت کی حد تک

پسند کرتے ہیں۔

گنڈا سنگھ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس برس ہے۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بھوسلے بال اُس کے چہرے کے دو تہائی حصے پر موبل آئل میں بھیگے ہوئے چیتھڑے کی طرح پھیلے رہتے ہیں۔ پگڑی کے نیچے اُسکے کیسوں کی بھی یہی حالت رہتی ہے۔ کبھی کبھی جب اُس کی پنڈلیاں کپڑا اٹھ جانے کے باعث ننگی ہو جاتی ہیں تو اُن پر میل کھرنڈوں کی شکل میں جا بجا نظر آتا ہے، مگر لوگ ان تمام میلی اور گندی حقیقتوں سے باخبر ہونے پر بھی گنڈا سنگھ کو اپنے پاس بٹھاتے ہیں اور اُس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے ہیں۔

امرتسر چھوڑ کر جب گنڈا سنگھ اپنے گرم شوٹ سمیت دہلی آیا تو اُسے غیر شعوری پر معلوم تھا کہ یہاں بھی خود بخود اُس کے دوست پیدا ہو جائیں گے۔ اگر اُس کو اپنی غلاظت پسندیوں کا احساس ہوتا تو بہت ممکن ہے یہ احساس رکاوٹ بن جاتا اور دہلی میں اُس کا کوئی دوست نہ بنتا۔

چند ہی دنوں میں بظاہر کسی وجہ کے بغیر آٹھ دس آدمی گنڈا سنگھ کے دوست بن گئے اور گنڈا سنگھ کو اس بات کا مطلق احساس نہ ہوا کہ اگر یہ آٹھ دس آدمی اُس کے دوست نہ بنتے تو شہر دہلی میں وہ بھوکوں مرتا۔

روٹی کے مسئلے پر دراصل گنڈا سنگھ نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اور نہ اُس نے کبھی یہ جاننے کی تکلیف کی تھی کہ دوسرے اِسکے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ کھانا، پینا اور سونا، یہ تین چیزیں ایسی تھیں کہ جو گنڈا سنگھ کو چلتے پھرتے کہیں نہ کہیں ضرور مِل جاتی تھیں اور ایک زمانہ سے چونکہ یہ چیزیں اُسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ مِل رہی تھیں اِس لیے ان کے متعلق وہ کبھی سوچتا ہی نہیں تھا۔

چاوڑی میں ہربنس سے ملنے گیا تو وہاں کا ناشتہ صبح مِل گیا۔ ہربنس کے

یہاں سے آیا تو راستے میں احمد علی نے دوکان پر ٹھہرا لیا اور کہا یہ جوگندر سنگھ، بھئی تم خوب وقت پر آئے، میں نے دھنا مل سے کچھ چاٹ منگوائی ہے، کھا کے جانا۔ احمد علی کی دکان پر چاٹ کھانے کے بعد گنڈا سنگھ کے دل میں خیال آیا کہ چلو ہیم چندر سے ملیں ہیم چندر بہت اچھا افسانہ نگار ہے اور گنڈا سنگھ کے دل میں اس کی بہت عزت ہے۔ چنانچہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔ دعوت دینے اور دعوت قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ کھانا آیا دونوں نے مل کر کھالیا۔ یہاں سے جب گنڈا سنگھ تیمار پور کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں باغ آگیا۔ دھوپ چونکہ بہت کراری تھی اس لیے گنڈا سنگھ جب کچھ دیر ستانے کے لیے نکلسن باغ کے ایک بنچ پر لیٹا تو پانچ بجے تک وہیں سویا رہا آنکھیں مل کر اٹھا اور آہستہ آہستہ تیمار پور کا رخ کیا جہاں اس کا دوست عبدالمجید رہتا تھا چھ بجے کے قریب گنڈا سنگھ عبدالمجید کے گھر پہونچا۔ وہاں جنگ کی باتیں شروع ہوئیں چنانچہ آٹھ بج گئے۔ عبدالمجید بہت ہوشیار آدمی تھا۔ ہندوستان کے ترقی پسند لٹریچر کے بارے میں اس کی معلومات کافی وسیع تھیں۔ مگر جنگ کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں تھا کوشش کرنے کے باوجود وہ چین اور جاپان، جاپان اور روس، روس اور جرمنی، جرمنی اور فرانس کے جغرافیائی رشتے کو نہ سمجھ سکا تھا۔ جب کبھی وہ دنیا کا نقشہ کھول کر اپنے سامنے رکھتا تو اس کی نگاہوں میں نقشے پر پھیلے ہوئے شہر اور ملک ایک ایسے الجھاؤ کی صورت اختیار کر لیتے جو اکثر اوقات پتنگ اڑانے کے دوران میں اس کی ڈور میں پیدا ہو جایا کرتے تھے مگر گنڈا سنگھ کو دنیا کے جغرافیائی صورت پر کافی عبور حاصل تھا۔ ایک اخبار پڑھ لینے کے بعد جنگ کا صحیح نقشہ اس کے ذہن میں آجاتا تھا اور وہ بڑے سہل انداز میں لوگوں کو سمجھا سکتا تھا کہ جنگ کے میدان میں کیا ہو رہا ہے۔

عبدالمجید طبعاً نفاست پسند تھا، اُسکو گنڈا سنگھ کی غلاظتیں بہت کھلتی تھیں۔ مگر وہ مجبور تھا اس لئے کہ گنڈا سنگھ ہی ایک ایسا آدمی تھا جو اُسے جنگ کے تازہ حالات سمجھا سکتا تھا۔ اگر عبدالمجید کو جنگی خبریں سننے اور اُن پر تفصیلی بحث کرنے کی عادت نہ ہوتی جو ایک بہت بڑی کمزوری کی شکل اختیار کر چکی تھی تو وہ یقیناً اس آدمی سے کبھی ملنا پسند نہ کرتا تھا جو کھانا کھانے کے بعد سالن سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کے کمرے میں لٹکے ہوئے پردوں سے صاف کرتا تھا۔ ایک دفعہ عبدالمجید نے پردوں کو اس کے حملے سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنا تولیہ آگے بڑھا دیا اور کہا یہ "گنڈا سنگھ، اس سے ہاتھ صاف کرو۔ کچھ دیر اگر ٹھہر سکو تو پانی اور صابن آرہا ہے"۔

گنڈا سنگھ نے اِس انداز سے تولیہ عبدالمجید سے لیا جیسے اسکی ضرورت ہی نہیں تھی اور ایک منٹ میں اپنا منہ ہاتھ صاف کر کے اُسے ایک طرف پھینک دیا۔ "پانی وانی کی کوئی ضرورت ہی نہیں، ہاتھ صاف ہی تھے"!

عبدالمجید نے جب زہر کے گھونٹ پی کر اپنے تولیے کی طرف دیکھا تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ منہ ہاتھ صاف کرنے کے بجائے کسی نے اُس کے ساتھ سائیکل کی چین صاف کی ہے۔

عبدالمجید کی بیوی کو گنڈا سنگھ کی یہ مکروہ عادات سخت ناپسند تھیں مگر وہ بھی مجبور تھی اس لئے کہ جس روز گنڈا سنگھ نہیں آتا تھا۔ عبدالمجید اُسے اپنے پاس بٹھا کر جنگ کے تازہ حالات پر ایک طویل لیکچر دینا شروع کر دیتا تھا جو اس امن پسند عورت کو طوعاً وکرہاً سارے کا سارا سننا ہی پڑتا تھا۔

گنڈا سنگھ ذہین آدمی تھا۔ ادب اور سیاست کے بارے میں اُس کی معلومات اوسط آدمی سے بہت زیادہ تھیں۔ امرتسر میں اسکے اس گرم سوٹ کا سوا بھی

ان معلومات کے ذریعے ہی سے ہوا تھا۔ محمد عمر ٹیلر ماسٹر کو جنگی خبریں سننے کا خبط تھا، چنانچہ گنڈا سنگھ نے جنگ کے ابتدائی حالات سُنا سُنا کر محمد عمر کو اس قدر مرعوب کیا کہ اس نے یہ گرم سوٹ (جو کسی گاہک نے ۱۹۳۷ء میں تیار کرایا تھا اور دو برس سے اس کے پاس بے کار پڑا تھا چونکہ اس گاہک نے پھر کبھی شکل ہی نہیں دکھائی تھی) گنڈا سنگھ کے جسم پر فٹ کر دیا تھا اور اس کے ساتھ پانچ روپے ماہوار کی چھ قسطیں مقرر کر لیں۔

ان چھ قسطوں میں سے صرف تین قسطیں گنڈا سنگھ نے ادا کی تھیں، باقی تین قسطوں کے لیے محمد عمر کئی بار تقاضا کر چکا تھا مگر ان رسمی تقاضوں کے علاوہ محمد عمر نے گنڈا سنگھ پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ اس لیے کہ جنگ کے حالات دن بدن دلچسپ ہوتے جا رہے تھے۔

گنڈا سنگھ نے امرتسر کیوں چھوڑا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ دہلی میں جو اس کے نئے دوست بنے تھے صرف ان کو اتنا معلوم تھا کہ امرتسر میں ایک پرانے دوست کے کہنے پر وہ یہاں چلا آیا تھا کہ ملازمت تلاش کرے۔

دہلی آ کر گنڈا سنگھ ملازمت کی جستجو کرتا مگر یہ کم بخت گرم سوٹ اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اس قدر گرمی پڑ رہی تھی کہ چیل انڈا چھوڑ دے۔ کچھ دنوں سے گرمی انتہا کی ہو گئی تھی۔ لوگ سن سٹروک سے مر رہے تھے۔ گنڈا سنگھ کو موت کا اتنا خیال نہیں تھا جتنا کہ اسے تکلیف کا خیال تھا جو گرمی کی شدت کے باعث اسے اٹھانا پڑ رہی تھی۔ بازاروں میں دھوپ پگھلی ہوئی اگنی کی طرح پھیلی رہتی تھی۔ لو اس غضب کی چلتی تھی کہ منہ پر آگ کے چانٹے پڑنے لگتے۔ ٹک بھری سڑکیں توے کی مانند تپتی رہتی تھیں۔ ان سب کے اوپر فضا کی گرم گرم اداسی تھی جو گنڈا سنگھ کو بہت پریشان کرتی تھی۔

اگر اس کے پاس یہ گرم سوٹ نہ ہوتا تو الگ بات تھی، شدید گرمیوں کا یہ موسم کسی نہ کسی حیلے کٹ ہی جاتا پر اس سوٹ کی موجودگی میں حبس کا رنگ اس کی مجوسیلی ڈاڑھی سے بھی زیادہ گہرا تھا اب ایک دن بھی دہلی رہنا اُسے دشوار معلوم ہوتا تھا۔ اس سوٹ کا رنگ سردیوں میں بہت خوشگوار معلوم ہوتا تھا پر اب گنڈا سنگھ کو اس سے ڈر لگتا تھا۔

سوٹ کا کپڑا بہت کھردرا تھا، کوٹ کا کالر گھسنے کے باعث بالکل ریگ مار کی صورت اختیار کر گیا تھا اس سے گنڈا سنگھ کو بہت تکلیف ہوتی تھی یہ گھسا ہوا کالر ہر وقت اوپر نیچے ہو کر اس گردن کے بال مونڈ رہتا تھا۔

ایک دو دفعہ جب غضب کی گرمی پڑی تو گنڈا سنگھ کے جی میں آئی کہ یہ گرم سوٹ اُتار کر کسی ایسی جگہ پھینک دے کہ پھر اُسے نظر نہ آئے مگر یہ سوٹ اگر وہ اُتار دیتا تو اس جگہ پہنتا کیا۔ اسکے پاس تو اس سوٹ کے سوا اور کوئی کپڑا ہی نہیں تھا۔ مجبوری گرمی کے احساس میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی تھی اور بے چارہ گنڈا سنگھ تلملا کے رہ جاتا تھا۔

دہلی میں اُس کے چند دوستوں نے اُس سے پوچھا تھا: بھئی گنڈا سنگھ تم یہ گرم سوٹ کیوں نہیں اتار دیتے کیا تمہیں گرمی نہیں لگتی؟ گنڈا سنگھ چونکہ ذہین آدمی تھا۔ اس لیے اُس نے یوں جواب دیا تھا، گرم کپڑا گرمی کی شدت کو روکتا ہے اس لیے میں یہ گرم سوٹ پہنتا ہوں۔ سن اسٹروک کا اثر ہمیشہ گلے کے پچھلے حصے پر پڑتا ہے جہاں حرام مغز ہوتا ہے اگر جسم کے اِس حصے پر گرم کپڑے کی ایک موٹی سی تہہ جمی رہے تو سورج کے اس حملے کا بالکل خدشہ نہیں رہتا افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں انگریز وغیرہ سولا ہیٹ کے پچھلے حصے کے ساتھ ایک کپڑا لٹکا دیتے ہیں کہ لُو سے بچے رہیں۔ عرب میں سر کیلئے ایک خاص پہناوا مروج

ہے۔ ایک بڑا سا رومال ہوتا ہے جو گردن کو ڈھانپے رہتا ہے۔ ہندوستان کے ان حصّوں میں جہاں شدید گرمی پڑتی ہے پگڑی کا رواج استعمال اب تک چلا آرہا ہے۔ شملہ چھوڑنے کا اب تک دراصل مطلب یہی تھا کہ گردن لُو سے محفوظ رہے۔ مگر اب لوگوں نے شملہ چھوڑنا قریب قریب ترک کر دیا ہے۔ اس لئے کہ اسے فضول سمجھا گیا ہے اور بغیر شملہ چھوڑے پگڑی باندھنا جدید فیشن بن گیا ہے۔ میں خود اس فیشن کا شکار ہوں۔"

یہ فاضلانہ جواب سن کر اُس کے دوست بہت مرعوب ہوئے تھے، چنانچہ پھر کبھی انہوں نے گنڈا سنگھ سے اُس کے سوٹ کے بارے میں، استفسار نہ کیا تھا۔ گنڈا سنگھ جس کو اپنی معلومات کا مظاہرہ کرنے کا شوق تھا اُس وقت یہ جواب دے کر بہت مسرور ہوا تھا مگر یہ مسرّت فوراً ہی اس سوٹ کی تکلیف دہ گرمی نے غائب کر دی تھی۔

عبدالمجید تیمار پور یعنی شہر کے مضافات میں رہتا تھا، جہاں کھلی فضا میسر آسکتی تھی۔ ایک رات جب تازہ جنگی حالات پر تبصرہ کرتے کرتے دیر ہو گئی تو عبدالمجید نے گنڈا سنگھ کے لیئے برآمدے کے باہر ایک چارپائی بچھوا دی۔ کوٹ اور واسکٹ اتار کر وہ پتلون سمیت اس چارپائی پر صبح چھ بجے تک سویا رہا رات بڑے آرام میں کٹی کھلی فضا تھی اس لئے ساری رات خنک ہوا کے جھونکے آتے رہے۔ گنڈا سنگھ کو یہ جگہ پسند آئی۔ چنانچہ اُس نے شام کو دیر سے آنا شروع کر دیا۔

عبدالمجید کی بیوی نے دس بارہ روز تک گنڈا سنگھ کا وہاں سونا برداشت کیا۔ لیکن اِس کے بعد اُس سے رہا نہ گیا۔ عبدالمجید سے اُس نے صاف صاف کہدیا "اصغر کے ابّا۔ اب پانی سر سے گذر چکا ہے میں اُس موٹے گنڈا سنگھ کا آنا یہاں آنا بالکل پسند نہیں کرتی۔ یہ مکان ہے یا سرائے ہے؟ — لیجئے وہ

عین کھانے کے وقت آ جاتا ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں آپ سے کرتا ہے، اور چارپائی بچھوا کر سو جاتا ہے۔ میں اُس کی غلاظتیں برداشت کر سکتی ہوں مگر اُس کا یہاں سونا بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ سُنا آپ نے۔ اگر کل وہ یہاں آیا تو میں خود اُس سے کہہ دونگی کہ سردار صاحب، جنگ کے متعلق آپ باتیں کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کیجئے۔ کھانا حاضر ہے۔ تو لئے۔ دروازوں کے پردے، گدیوں کے غلاف، یہ تمام چیزیں بڑے شوق سے منہ پوچھنے کے استعمال کیجئے مگر رات کو آپ یہاں ہرگز نہیں سو سکتے — اصغر کے ابّا، میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں میں بہت تنگ آ گئی ہوں"۔

عبدالمجید کو خود گنڈا سنگھ کا وہاں سونا بُرا معلوم ہوتا تھا، اس لئے کہ اُس کی بیوی پرلی طرف آنگن میں اکیلی رہتی تھی مگر وہ کیا کرتا۔ جبکہ جنگ کی دلچسپ باتیں کرتے کرتے دیر ہو جاتی تھی اور گنڈا سنگھ بغیر کسی تکلیف کے جیسے کہ اُس کا روزانہ معمول ہو۔ اُس سے کہہ دیا تھا: "بھائی عبدالمجید اب تم جاؤ۔ صبح اُٹھ کر تازہ اخبار دیکھیں گے تو نئے حالات کا کچھ پتہ چلے گا"۔ یہ کہہ کر وہ برآمدے میں سے چارپائی نکالتا اور باہر بچھا کر سو جاتا۔

جب عبدالمجید کی بیوی اس پر بہت برسی تو اُس نے کہا:

"جانِ من میں خود حیران ہوں کہ اس کو کس طرح منع کروں یہاں دہلی میں اُس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں۔ مجھے اب اس بات کا خوف لاحق ہو رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے میرے مکان کو اپنا اڈا بنا لے گا آدمی بیحد اچھا ہے یعنی لائق ہے، ذہین ہے پر..... کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"۔

یہ سُن کر عبدالمجید کی بیوی نے کہا: "تو یہ ترکیب تو تم ہی سوچو

— میں تو صاف گو ہوں، اگر مجھ سے کہو گے تو میں کھلے لفظوں میں اُس سے کہدوں گی کہ تمہارا یہاں رہنا مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے۔"

عبدالمجید نے اُسی وقت تہیہ کر لیا کہ وہ گنڈا سنگھ سے اپنی مشکلات اور مجبوریاں صاف لفظوں میں بیان کر دے گا۔ چنانچہ جب شام کو گنڈا سنگھ آیا تو جنگ کے تازہ حالات پر بحث شروع کرنے کے بجائے عبدالمجید نے اُس سے کہا "گنڈا سنگھ میں تم سے ایک بات کہوں۔ بُرا تو نہیں مانو گے؟"

گنڈا سنگھ نے ہمہ تن گوش ہو کر جواب دیا "بُرا ماننے کی بات ہی کیا ہے۔ آپ کہیئے۔"

اس پر عبدالمجید نے ایک مختصر سی رسمی تمہید شروع کر دی پھر اُس کے آخر میں کہا "— بات یہ ہے کہ سردیوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کی رہائش کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں گنجائش نکل آتی ہے۔ مگر ان گرمیوں میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ مردوں کو اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ مستورات کو ہوتی ہے تم خود سمجھ سکتے ہو۔"

گنڈا سنگھ مطلب سمجھ گیا۔ چنانچہ اُس نے پہلی مرتبہ اپنی تکلیفیں بیان کرنا شروع کیں — "بھائی عبدالمجید میں تمہاری مہربانیوں کا بہت شکر گزار ہوں۔ رات کاٹنے کے لئے یوں تو مجھے بہت جگہیں مل سکتی ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ایسی کھلی ہوا کہیں نہیں ملتی۔ سارا دن بلکہ اس گرم سوٹ میں پگھلتا رہتا ہوں۔ چند راتیں جو میں نے تمہارے یہاں بسر کی ہیں، میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے تمہاری مجبوریوں اور تکلیفوں کا احساس اب ہوا ہے اس لئے کہ جو آرام مجھے یہاں رات کو ملتا تھا اِس قدر خوشگوار تھا کہ میں نے دوسرے پہلو پر کبھی غور ہی نہ کیا — تم

میرے دوست، ہو کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ اس گرم سوٹ سے مجھے نجات مل جائے، اس طور پر کہ یہ گرم سوٹ بھی میرے پاس رہے اور گرمیوں کا موسم بھی کٹ جائے۔ کیونکہ دو تین مہینے کے بعد پھر سردیاں آنے والی ہیں اور مجھے پھر اس سوٹ کی ضرورت ہوگی —— سچ پوچھو تو اب میں، دیوانگی کی حد تک اس سوٹ کی گرمی سے بے زار ہو گیا ہوں —— تم خود سمجھ سکتے ہو!"

عبدالمجید سب سمجھ گیا، گنڈا سنگھ رخصت ہوا تو عبدالمجید نے اپنی بیوی سے بات چیت کی۔ دونوں دیر تک اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے آخر میں اُس کی بیوی نے کہا: "صرف ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ گنڈا سنگھ کو کسی ایسی جگہ بھیجدیا جائے جہاں گرمی نہ ہو"

یہ سُن کر عبدالمجید نے کہا: "ٹھیک ہے پر اس کے لئے رقم کی ضرورت ہے اگر میرے پاس فالتو روپے ہوتے تو کیا میں نے اُسے ٹھنڈے کپڑے نہ بنوا دیئے ہوتے"

اس پر عبدالمجید کی بیوی نے کہا: "تم پوری بات تو سُن لیا کرو۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ اُسے شملہ بھیجدیا جائے۔ میرا بھائی نصیر کل آنے والا ہے اس سے کہدینگے وہ گنڈا سنگھ کو بغیر ٹکٹ وہاں پہونچا دے گا۔ ایک دو بار وہ مجھے بھی تو شملہ لے گیا تھا"

عبدالمجید یہ بات سُن کر اس قدر خوش ہوا کہ اُس نے اپنی بیوی کا منہ چوم لیا: "بھئی کیا ترکیب سوچی ہے —— یعنی سوٹ گنڈا سنگھ کے جسم پر ہی رہے گا اور وہ شملے پہونچ جائے گا۔ اس سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے"

دوسرے روز شام کو گنڈا سنگھ آیا تو عبدالمجید نے شملہ جانے کی رائے

پیش کی۔ یہ سُن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اُس نے قطعاً نہ سوچا کہ شملے جا کر وہ بغیر روپے پیسے کے کس طرح گذارہ کرے گا۔ دراصل ایسی باتوں پر اُس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

تیسرے دن فقیر نے گنڈا سنگھ کو گاڑی میں سوار کرا دیا اور گارڈ سے جو کہ اُس کا دوست تھا کہہ دیا تھا کہ وہ اُسے بحفاظت تمام شملے پہونچا دے۔

میرا ہم سفر

پلیٹ فارم پر شہاب سعید اور عباس نے ایک شور مچا رکھا تھا یہ سب دوست مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لئے آئے تھے، گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ شہاب نے بڑھ کر پائدان پر چڑھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"عباس کہتا ہے کہ گھر جا کر اپنی "انکی" خدمت میں سلام ضرور کہنا"

"وہ تو پاگل ہے ــ اچھا خدا حافظ" میں نے ان علیگی دوستوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے یہ الفاظ جلدی میں ادا کیے، اور شہاب سے ہاتھ ملا کر دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

علیگڈھ اور اُسکی حسین علمی فضا جس میں میں اس سے کچھ عرصہ پہلے سانس لے رہا تھا، اب مجھ سے ایک طویل عرصہ کے لئے دُور ہو رہی تھی۔ میرا دل سخت مغموم تھا۔ شہاب اگرچہ کالج میں بہت تنگ کرتا تھا مگر اُس سے جدا ہونے کا مجھے اب احساس ہوا۔ جب میں نے دفعتہً خیال کیا کہ امرتسر میں مجھے ایسا دلچسپ دوست میسر نہ آسکے گا۔ اسی خیال کے غم افزا اثر کے تحت میں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے اور اس عمل سے گویا اپنے ذہن سے اس تاریکی کو جھٹکتے ہوئے، جیب میں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور اسمیں سے ایک سگرٹ نکال کر اُس کو سلگایا اور

اطمینان سے نشست پر ٹھکانے سے بیٹھ کر اپنے سامان کا جائزہ لیا اور پھر اپنے ساتھی کی طرف جو سیٹ کے آخری حصے پر بیٹھا تھا، پیٹھ کر کے سگرٹ سے دھوئیں کے چھلے بنانے کی بے سود کوشش میں مصروف ہو گیا۔

میں بالکل خالی الذہن تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟ سگرٹ کا دھواں جس کو میں اپنے منہ سے چھلوں کی صورت میں نکالنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہوا کے تند جھونکوں کی تاب نہ لا کر کھڑکی کے راستے کسی تھرکتی ہوئی رقاصہ کی طرح تڑپ کر باہر نکل رہا تھا۔ میں بہت عرصہ تک سگرٹ کے اس لرزاں دھوئیں کو بڑے غور سے دیکھتا رہا — یہ رقص کی ایک تکمیل تھی۔

"رقص کی تکمیل" یہ الفاظ دفعتہً میرے دماغ میں پیدا ہوئے اور میں اپنے اس اچھوتے خیال پر بہت مسرور ہوا۔

"کیا میں پاگل ہوں؟

گاڑی پلیٹ فارم کو چھوڑ کر کھلے میدانوں میں دوڑ رہی تھی۔ آہنی پٹڑیوں کا بچھا ہوا جال بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پتھریلی روش کے آس پاس آگے ہوئے درخت ایک دوسرے کا تعاقب کرتے معلوم ہوتے تھے یعنی رقص کی تکمیل، اور ان درختوں کی بھاگ دوڑ کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ ان حیران کن الفاظ نے مجھے چونکا دیا غالباً میرے اس ہم سفر نے ادا کئے تھے جو سیٹ کے آخری حصے پر کونے میں بیٹھا تھا۔ اس نے یقیناً یہ عجیب سا سوال مجھ سے ہی پوچھا تھا۔

"کیا آپ مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں؟"

"جی ہاں، کیا میں پاگل ہوں؟" اس نے ایک بار پھر مجھ سے دریافت کیا۔

ٹرین کی روانگی پر جب میں نے شہاب سے یہ کہا تھا "وہ تو پاگل ہے — اچھا خدا حافظ" تو شاید اس شریف نے یہ خیال کر لیا تھا کہ میں نے اسی کو پاگل کہا ہے — میں کھکھلا کر ہنس پڑا اور نہایت مؤدبانہ لہجہ میں کہا:

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے حضرت، گاڑی چلتے وقت شاید میں نے اپنی کسی دوست کو پاگل کے نام سے پکارا تھا۔ وہ تو ہے ہی پاگل میں معافی چاہتا ہوں کہ آپکو خواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔"

یہ معقول دلیل سنکر میرا ہم سفر جو غالباً اور کچھ کہنے کے لئے ذرا آگے سرک رہا تھا خاموش ہوگیا۔ یہ دیکھ کر مجھے گونہ اطمینان ہوا کہ معاملہ نہیں بڑھا۔ اتفاق سے میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ عموماً نکمی سے نکمی باتوں پر طیش آجایا کرتا ہے چونکہ اس سے قبل کئی مرتبہ دوران سفر میں میرا مسافروں سے جھگڑا ہو چکا تھا۔ اور میں اُس کے تلخ نتائج سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے لازمی طور پر میں اس معاملہ کو اتنی جلدی، بخیر و خوبی انجام پاتے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ چنانچہ میں نے اُس مسافر سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لئے اس سے ایسے ہی گفتگو شروع کی — رسمی گفتگو جو عام طور پر گاڑیوں میں مسافروں کے ساتھ کی جاتی ہے۔

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" میں نے اُس سے دریافت کیا۔

"میں —" یہ کہتے ہوئے وہ کونے سے سرکتا ہوا اُٹھ کر میرے مقابل والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "میں دہلی جا رہا ہوں — آپ کہاں اتریں گے؟"

"مجھے کافی طویل سفر کرنا ہے — امرت سر جا رہا ہوں۔"

"امرتسر۔"

"جی ہاں۔"

"مجھے یہ شہر دیکھنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا ہے۔ اچھی بارونق جگہ ہے کپڑے کی تجارت کا مرکز ہے۔ کیا آپ وہاں کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"جی ہاں" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اُس کا سوال میرے نزدیک بہت غیر دلچسپ تھا، اس کے علاوہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے اپنے ہم سفر سے یہ کہا ہوتا کہ میں علی گڑھ کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں تو وہ کالج کی دلچسپیوں، اس کی عمارت اور اس کے خدا معلوم کن کن حصوں میں اور شعبوں کے متعلق مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتا۔ اس سے قبل میرے ساتھ اس قسم کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ جب میرے ایک رفیق سفر نے سوال پوچھ پوچھ کر رات کی نیند مجھ پر حرام کر دی تھی۔

"کون سے کالج میں ــــ میرے خیال میں وہاں کئی کالج ہیں" اُس نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے جھوٹ سے جواب دیا "خالصہ کالج میں"

"اچھا، وہی جو اینڈرسن نے تعمیر کرایا ہے"

"اینڈرسن نے، مگر وہ سکھوں کا کالج ہے حضرت" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مسٹر، یہ اینڈرسن سکھ ہو گیا تھا ــــ آپ نے غالباً سکھ ہسٹری کا مطالعہ نہیں کیا"

"شاید"

یہ کہہ کر میں نے گفتگو کو دلچسپ نہ پاتے ہوئے منہ موڑ لیا اور کھڑکی کے باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ گاڑی اب یو۔ پی کے وسیع میدانوں میں دندناتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ لوہے کے پہیوں کی وزنی جھنکار اور چوبی شہتیروں کی کھٹ کھٹ فضا میں ایک عجیب یک آہنگ شور برپا کر رہی تھی اور اس شور کی صدائے بازگشت نے آس پاس کے دوڑتے ہوئے کھمبوں اور درختوں سے ٹکرا کر شام کی خنک ہوا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ میں نے ایسے ہی کھڑکی میں سے اپنا بازو باہر نکالا منہ زور گاڑی کی تیز رفتار کی وجہ سے ہوا کے زبردست دھکے نے میرے بازو کو ریلا دیکھ

پیچھے دبادیا ——— میں نے ٹھنڈی ہوا کے اس دباؤ کو بہت پیار محسوس کیا۔ چنانچہ میں کھیل میں مصروف ہو گیا اور اپنے ہم سفر اور اُس کی گفتگو کو بالکل بھول گیا۔ ہوا کے دباؤ کی دل نوازی بہت مسرور کن تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے اِس کھیل سے اُکتا گیا۔ دراصل بار بار ہوا کو چیرنے سے میرا بازو تھک گیا تھا۔ اب میں نے مڑ کر میدانوں کی وسعت کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخی — آتشیں دسرخ کر زمیں میدان کے گڑھوں میں بارش کے جمع شدہ پانیوں پر زر نگاری کا کام کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری زمین کے سینے پر کسی نے بڑے بڑے آئینے آویزاں کر دیئے ہیں۔ بجلی کے تاروں اور کھمبوں پر نیل کنٹھ اور ابابیلیں پھدک رہی تھیں — یہ منظر بہت سہانا تھا۔

"کیا میں پاگل ہوں؟"

ان الفاظ نے ایکبار پھر اُن رنگوں کو منتشر کر دیا جو میرے دل و دماغ پر ایک نہایت ہی پیاری تصویر کھینچ رہے تھے۔ میں چونک پڑا۔ میرے اسی ہم سفر نے مجھ سے یہ سوال دریافت کیا تھا۔ میں مڑا۔ وہ میری طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید میرے کان کو دھوکا ہوا ہے میں نے اُس سے کہا:۔

"کیا ارشاد فرمایا آپ نے؟"

وہ ایک لمحہ خاموش رہا اور پھر اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی نہیں، شاید آپ نہ بتا سکیں گے۔

اب میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر غالباً بیس بائیس برس کے قریب ہوگی۔ ڈاڑھی کمال صفائی سے مونڈی ہوئی تھی۔ اُس کے گال گوشت سے

بکھرے ہوئے تھے، ان کی موٹائی میں بہت سا فرق تھا، جو صرف مجھ ایسا باریک بین ہی دیکھ سکتا ہے بال جن میں سے کسی اچھے اور بڑھیا تیل کی خوشبو آ رہی تھی، پیچھے کی طرف کنگھی کیئے گئے تھے جس سے اُس کی پیشانی بہت کشادہ ہو گئی تھی۔ وہ معمولی قسم کے کشمیرے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کلف شدہ کالر قمیص کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ مگر ٹائی موجود نہ تھی — یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ پھر بولا:۔

"میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں"

میں اُس کے روز آنہ پیچھے سے متحیر ہوا۔ آخر وہ مجھ سے کیا، دریافت کرنا چاہتا ہے؟ یہ خیال کرتے ہوئے میں جھک کر گویا اُس کے سوال کا جواب دینے کے لیئے تیار ہو کر کہا "بصد شوق — فرمایئے"

"کیا میں پاگل ہوں"

میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ جواب کیا دوں آپ ہی فرمایئے۔ میں اُس شخص کو کیا جواب دے سکتا تھا۔ بظاہر نہایت ہی ہوشمند انسان معلوم ہوتا تھا — بالکل میری اور آپ کی طرح۔

"آپ؟ ...... آپ؟" — میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں میں۔ آپ فرمایئے نا؟" اُس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے دریافت کیا۔

"مگر کیوں؟ آپ بڑے ہوشمند انسان ہیں — !"

"آپ اپنی رائے مرتب کرنے میں جلدی سے کام نہ لیجئے، پھر غور فرما کر جواب دیجئے، کیا میں واقعی پاگل ہوں"

اس میں غور کرنے کی بات ہی کوئی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنے ہم سفر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔ دراصل میں دو چیزیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اولاً یہ کہ کہیں وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا۔ ثانیاً یہ کہ شاید اُس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ ظاہر کر دے کہ وہ سچ مچ پاگل ہی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے سنا تھا۔ کہ عام طور پر پاگلوں کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے اُبھرے ہوتے ہیں۔ مگر وہ آنکھیں جو میری طرف دیکھ رہی تھیں، غیر معمولی طور پر سفید تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سفید چینی کی بنی ہوئی ہیں۔ میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

"آپ کو کسی نے غلط طور پر شک میں ڈال دیا ہے" یہ کہتے ہوئے میں نے خیال کیا کہ شاید کسی ڈاکٹر نے اسکو وہم ڈال دیا ہے کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آج کل کے سستے اور جاہل ڈاکٹر بغیر سوچے سمجھے نبض پر ہاتھ رکھ کر کسی کو دیوانہ کسی کو مدقوق اور کسی کو ضعف اعصاب کا مریض، ٹھہرا دیتے ہیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ مگر آپ کو قطعی طور پر یقین ہے کہ میں واقعی پاگل نہیں ہوں" اُس نے کہا۔

"قطعی طور پر——جس شخص نے آپ کو اس وہم میں مبتلا کر دیا ہے میرے خیال میں وہ خود پاگل ہے"

"خیر وہ تو پاگل نہیں، اچھا بھلا ہے"

"وہ کون بزرگ ہیں؟"

"میرا اپنا باپ"

"آپ کا باپ"

"جی ہاں — وہ کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں، حالانکہ میں خود اِس قسم کی

کوئی علامت نہیں پاتا۔ آج سے ایک سال قبل اُس کی نظروں میں پاگل نہ تھا لیکن جونہی میری شادی ہوئی، میرے باپ نے کہنا شروع کر دیا کہ موہن دیوانہ ہے چنانچہ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سسرال والوں نے ڈر کے مارے اپنی لڑکی کو گھر بلوالیا۔ اب وہ اُس کو میرے حوالے نہیں کرتے۔ کس قدر رنج افزا بات ہے کہ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ دس پندرہ دن بھی بسر کرنے میسر نہیں ہوئے۔"

یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ واقعتاً وہ بہت مغموم ہے میں بھی بہت متاثر ہوا لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اُس کے باپ نے اسے خواہ مخواہ پاگل بنا کر اُس کی زندگی کیوں تلخ کر دی ہے۔

"مگر آپ کے والد صاحب نے یہ حرکت کیا کی؟" میں نے اُس کی داستان میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر، وہ یہودی ہے — پکا یہودی۔ اُس کو صرف اپنے طلائی سکوں سے غرض ہے اور بس میں اُس کے خون کا ایک حصہ ہوں مگر یہ چیز اُس کے دل پر اثر نہیں کر سکتی ہے اگر اُس نے مجھے پاگل بنایا ہے تو اُس میں بھی کوئی بڑا راز مضمر ہے۔ وہ اسقدر نفس پرست ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس کی جائداد اُس کے اپنے لڑکے کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ دیکھئے، میں نے تین سال ہوئے بی۔ اے پاس کیا ہے۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ میں کوئی نوکری حاصل نہیں کر سکا ہوں مگر میرے باپ کو یہ تو چاہیے کہ وہ مجھے اچھا خرچ دے۔"

"یقیناً" میں نے پر زور تائید کی۔

"لیکن وہ مجھے صرف پانچ روپے ماہوار دیتا ہے — حقیقت تو یہ ہے کہ اُس نے میرے شباب کی تمام رنگینیوں پر اپنی ہوس پرستیوں سیاہی الٹ دی ہے۔ میں آگرہ میں پڑا ہوں، میری بیوی دہلی میں ہے۔ میرے اس یہودی

باپ نے میرے اور اُس کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے میں اُس سے بے حد محبت کرتا ہوں وہ خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے۔ مگر وہ مجبور ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو۔ اب میں اُس کا فیصلہ کر دینا چاہتا ہوں، میں نے اپنی تین پتلونیں اور تین کوٹ بیچ دیے ہیں۔ اب میں دہلی جا رہا ہوں۔ دیکھا جائے گا جو ہو گا"

"آپ اپنی بیوی کے پاس جا رہے ہیں" میں نے اُس سے دریافت کیا

"جی ہاں۔ میں گھر میں بغیر اجازت لیئے داخل ہو جاؤنگا اور وہاں سے اپنی بیوی کو لیئے بغیر ہرگز ہرگز نہ ٹلوں گا۔

اگر میں پاگل ہوں، تو ہوں — مگر مجھے یقین ہے کہ سوشیلا (یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا جھینپ گیا) میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گی۔ میں نے اس کے لیئے، نمائش میں سے ایک اونی سوئیٹر خریدا ہے وہ اسکو یقیناً پسند کرے گی۔ کیا آپ اُسے دیکھنا پسند فرمائیں گے؟"

"اگر آپ کو ٹرنک وغیرہ کھولنے کی زحمت نہ اُٹھانا پڑے" میں نے جواب دیا۔

"نہیں صاحب، یہ تو میں نے قمیص کے اندر خود پہن رکھا ہے" یہ کہکر وہ اُٹھا اور کوٹ اتار دیا۔ پھر قمیص کو پتلون کی گرفت سے آزاد کر کے اُس نے اُسے بھی اتار دیا — وہ واقعی ایک رنگ برنگی فیتوں والا زنانہ سوئیٹر پہنے ہوئے تھا۔

"کیا آپکو پسند ہے؟ — یہ میں نے اس لیئے پہن رکھا ہے کہ اگر سوشیلا نے اس کے پہننے سے انکار کر دیا تو میں اسے پہنے ہی رہونگا"

اس زنانہ سوئیٹر میں وہ کس قدر عجیب معلوم ہوتا تھا

پریشانی کا سبب

نعیم میرے کمرے میں داخل ہوا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے
اُس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور اخبار کی آخری کاپی کے لیے جو مضمون لکھ رہا
تھا اُسکو جاری رکھنے والا ہی تھا کہ مجھے نعیم کے چہرے پر ایک غیر معمولی تبدیلی
کا احساس ہوا۔ میں نے چشمہ اُتار کر اُسکی طرف پھر دیکھا اور کہا "کیا بات ہے
نعیم۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری طبیعت ناساز ہے"

نعیم نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور جواب دیا "کیا بتاؤں عجیب
مشکل میں جان پھنس گئی ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک ایسی بات ہوئی ہے کہ میں
کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا"

میں نے کاغذ کی جتنی پرچیاں لکھی تھیں جمع کر کے ایک طرف رکھدیں اور
زیادہ دلچسپی لے کر اُس سے پوچھا "کوئی حادثہ پیش آگیا۔ فلم کمپنی میں کسی ایکٹرس سے
نعیم نے فوراً ہی کہا "نہیں بھائی"۔ ایکٹر ایکٹرس سے کچھ بھی نہیں ہوا ایک اور
ہی مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔ تمہیں فرصت ہو تو میں ساری داستان سناؤں"

نعیم میرا دوست ہے۔ جب سے وہ بمبئی سے آیا ہے اُس سے میری دوستی چلی آرہی ہے
وہ یوں کہ بمبئی آتے ہی اُس نے میرے اخبار میں کام کیا اور خود کو بہت سی اہلیتوں کا مالک

شناخت کیا۔ پھر آہستہ آہستہ جب مجھے اُس کے اعلیٰ خاندان کا پتہ چلا اور اِسی قسم کی دوسری واقفیتیں نکلتی آئیں تو میرے دِل میں اس کی عزت اور بھی زیادہ ہو گئی، چنانچہ چھ مہینے کے مختصر عرصے ہی میں وہ میرا بے تکلف دوست بن گیا۔

نعیم نے میرے اخبار کو دلچسپ بنانے کے لیئے مجھ سے زیادہ کیں۔ ہر ہفتے جب اُس نے ایک نئی کہانی لکھنا شروع کی اور میں نے اُسکی تین چار کہانیاں پڑھیں تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اخبار میں اگر نعیم پڑا رہا تو اُس کی تمام ذکاوتیں تباہ ہو جائیں گی، چنانچہ میں نے موقعہ ملتے ہی ایک فلم کمپنی میں اُس کی سفارش کی اور وہ مکالمہ نگار کی حیثیت سے فوراً ہی وہاں ملازم ہو گیا۔

فلم کمپنی کی ملازمت کے دوران میں نعیم نے وہاں کے سیٹھوں اور ڈائرکٹروں پر کیا، اثر ڈالا، اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ میں بے صبرا آدمی ہوں لیکن نعیم سے ایک دو بار مجھے اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہاں اُس کا کام پسند کیا گیا ہے۔ اب ایکا ایکی نہ جانے کیا حادثہ پیش آیا تھا جو اُس کا رنگ یوں ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔

نعیم بے حد شریف آدمی تھا۔ اُس سے کسی نامعقول حرکت کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں سخت متحیر ہوا کہ ایسی کونسی اُفتاد پڑی کہ جو نعیم کسی کو اپنا مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ میں نے اُس سے اجازت لے کر جلدی جلدی آخری، کاپی کے لئے مضمون کا بقایا حصہ مکمل کیا اور تمام پرچیاں کاتب کو دے کر اسکے پاس بیٹھ گیا۔ "بھئی معاف کرنا میں فوراً ہی تمہاری داستان نہ سن سکا..... دیکھو میں پوچھتا ہوں یہ داستان آخر ہے کیسی ...... تم ...... تم ..... خیر چھوڑو اس قصے کو تم مجھے سارا واقعہ سناؤ۔"

نعیم نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا "اب میں تمہیں کیا بتاؤں، جو کچھ

ہوا، میری اپنی بیوقوفی کی بدولت ہوا۔ ہماری فلم کمپنی میں ایک ایکٹر ہے۔ عاشق حسین اوّل درجے کا چُغد ہے۔ چونکہ دوسروں کی طرح میں اسے ستاتا نہیں ہوں اس لیے وہ مجھ پر بری طرح فریفتہ ہے۔ یہ فریفتہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہ مجھ سے اسی طرح باتیں کرتا ہے جس طرح خوبصورت عورتوں سے کی جاتی ہیں۔

میں ہنس پڑا۔ "پر تم اتنے خوبصورت تو نہیں ہو۔"

نعیم کے پیلے چہرے پر ہنسی کی لال دھاریاں پھیل گئیں۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ہے۔ دراصل وہ اپنے اخلاص اور اپنی بے لوث محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور چونکہ اُسے ایسا کرنے کا طریقہ نہیں آتا اس لیے اُس کا پیار وہی شکل اختیار کر لیتا ہے جو غالباً اپنی بیوی سے اُس کو ہوگا۔۔۔۔۔ ہاں تو یہ عاشق حسین صاحب جو اول درجہ کے رقاص ہیں اور رقص کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتے پرسوں شوٹنگ کے بعد مجھے ملے۔ سیٹ پر میں نے اُن کے مکالمے درست کرنے میں کافی محنت کی تھی اس کا حق ادا کرنے کے لیے اُنہوں نے فوراً ہی کچھ سوچا اور کہا۔ "نعیم صاحب، میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "فرمائیے۔" اُنہوں نے پھر کچھ سوچا اور کہا۔ "دن بھر کام کرنے کے بعد میں تھک گیا ہوں آپ بھی ضرور تھک گئے ہوں گے چلیے، کہیں گھوم آئیں۔" —— اب یہاں اپنی ایک کمزوری بتا دوں گا۔ موسم اگر خوشگوار ہو تو میں عموماً بہک جاتا ہوں۔ شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اُداسی گھلی ہوئی تھی۔ جوان کنوارے آدمیوں کے دل میں ایسی اُداسی ضرور موجود ہوتی ہے جو کہ ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتی ہے میرے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی جس میں میں نے جوہو کے سمندری کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو نم آلود ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے بھاری بھاری ریشمی ساڑھیاں پہن کر عورتیں چلتی

ہیں ۔۔۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ "چلیے، مگر کہاں جائیے گا؟" اب عاشق حسین نے پھر سوچا اور کہا۔ "کہیں بھی چلے چلیں گے ۔۔۔ یہاں سے باہر تو نکلیں"۔ .... ہم دونوں گیٹ سے باہر نکلے اور موٹر بس کا انتظار کرنے لگے"۔

یہاں تک کہہ کر نعیم رُک گیا۔ اُس کے چہرے کی زردی اب دُور ہو رہی تھی۔ میں نے اُس کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہا۔ "تم دونوں گیٹ سے باہر نکل کر بس کا انتظار کرنے لگے"۔

نعیم نے سر ہلایا اور شامتِ اعمال اُدھر سے عاشق حسین کے ایک مارواڑی دوست کا گذر ہوا۔ وہ موٹر میں جا رہا تھا کہ اچانک عاشق حسین کی نظر اُس پر پڑی۔ فوراً ہی اُس نے مارواڑی زبان میں اپنے دوست کو ٹھہرنے کے لیے کہا۔ موٹر رُکی عاشق حسین نے اُس سے مارواڑی زبان میں چند باتیں کیں پھر دوڑ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا "چلیے کام بن گیا موٹر مل گئی اس میں چلتے ہیں"۔ میں چل پڑا موٹر میں داخل ہونے سے پیشتر عاشق حسین نے اپنے مارواڑی دوست سے جو شکل و صورت کے اعتبار سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ تعارف کرایا اور حسبِ معمول مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا۔ یہ مارواڑ کے بہت بڑے سیٹھ ہیں یہاں ایک کاروبار کے سلسلے میں آئے ہیں میرے بہت مہربان دوست ہیں"۔ اور میرے متعلق اپنے دوست سے کہا۔ "یہ ہندوستان کے بہت بڑے اسٹوری رائٹر ہیں"۔ ہندوستان کے بہت بڑے اسٹوری رائٹر ہیں اور مارواڑ کے بہت بڑے سیٹھ نے ہاتھ ملائے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ رسمی طور پر خوش ہوئے اور موٹر چلی۔" یہ سن کر میں مسکرایا۔ "نعیم، اس مارواڑی سیٹھ کے متعلق تمہاری رائے بہت خراب معلوم ہوتی ہے۔ کہیں آگے چل کر یہ ولن کا پارٹ ادا تو نہیں کرے گا"۔

"تم پہلے پوری داستان سن لو۔ پھر سوچنا کہ ولن کون ہے اور ہیرو کون لیکن

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کہانی کی ہیروئن زہرہ ہے — زہرہ جس کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کل۔ داور کی ایک فوجداری عدالت میں دیکھا ہے۔ ایک مجرم کی حیثیت میں۔"

یہ کہتے ہوئے نعیم کے کان کی لویں شرم کے باعث سُرخ ہو گئیں۔ داستان سننے کے دوران میں پہلی مرتبہ زہرہ کے اچانک ذکر سے مجھے سخت تعجب ہوا۔ میں نے کہا "نعیم یہ تو بالکل اگر تلد پو کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ زہرہ بالکل پو کے افسانوں کے غیر متوقع انجام کی طرح اس داستان میں آئی ہے۔ یہ عورت کون ہے؟"

"میں قطعاً نہیں جانتا، یعنی اگر مجھے اس عورت کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھ پر لعنت۔ خدا معلوم کون ہے پر اب میں اتنا جانتا ہوں کہ اس نے ہم لوگوں پر فوجداری مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ جرم ڈاکہ اور چوری ہے۔"

میں نے تعجب سے پوچھا "ڈاکہ اور چوری"

نعیم کے لہجے نے ایسی متانت اختیار کی جیسی روحانی اذیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی کہنے لگا "ہاں ڈاکہ اور چوری مجھے دفعات اچھی طرح یاد نہیں مگر ان کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے مداخلت بیجا کی، زہرہ کے گھر ڈاکہ ڈالا۔ اور اس کی چند قیمتی اشیاء چرا کر لے گئے۔ لیکن یہ تو داستان کا انجام ہے پہلے کے واقعات تمہیں سنا لوں پھر اس طرف آتا ہوں — میں کیا کہہ رہا تھا؟"

میں نے جواب دیا "یہ کہ تم اس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گئے۔"

"ہاں میں عاشق حسین کے کہنے پر اس منحوس مارواڑی کی موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر وہ خود چلا رہا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا جو اس سے کم منحوس نہیں تھا۔ عاشق حسین نے شاید اسکے متعلق کہا تھا کہ وہ موٹریں بنانے کا کام کرتا ہے خیر موٹر مختلف بازاروں سے ہوتی ہمنی دادر کی طرف چل نکلی۔ ظاہر تھا کہ ہم جو ہو جائیں گے، چنانچہ میں بہت خوش تھا جو ہو کی گیلی گیلی ریت سے مجھے بیحد پیار ہے کبھی کبھی ادھر جا کر میں گیلی ریت پر ضرور لیٹا کرتا ہوں اور دیر تک کھلے آسمان کی طرف دیکھا کرتا ہوں جو اتنا ہی پُر اسرار اور ناقابلِ رسائی دکھائی دیتا ہے جتنا کہ ایک اجنبی عورت کا تصور — سامنے رات کی سرمئی روشنی میں سمندر کروٹیں لیتا ہے، اوپر گدلے آسمان پر تارے یوں

چمکتے ہیں جیسے انہونی باتیں کسی جوان آدمی کے دل میں تمنائیں ابھری ہوں، ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ دُور اُس پار جہاں آسمان اور سمندر کوئی واضح خط بنائے بغیر آپس میں گھل مل جاتے ہیں، ایک ایسی دُھندلی روشنی نظر آیا کرتی ہے۔ جو خوبصورت شعروں کی طرح معصوم سی ہوتی ہے۔ میں جوہو کی سیر کے خیال میں مگن تھا کہ عاشق حسین نے موٹر کو وادری میں ایک جگہ ٹھیرا لیا اور مجھ سے کہا: "چلیے، کچھ پی لیں؛ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، بیئر مجھے پیاری ہے۔" عاشق حسین کو خدا معلوم کہاں سے اس بات کا پتہ چلا تھا کہ میں بیئر پیار کرتا ہوں۔ خیر، ہم چاروں بار میں داخل ہوئے، ایک بوتل بیئر کی میں نے پی اور ایک عاشق حسین نے بار والی سیٹھ اور موٹریں بنانیوالے نے کچھ نہ پیا۔ ہم جلدی ہی فارغ ہو گئے پھر موٹر میں بیٹھے اور جوہو کا رُخ کیا مگر فوراً ہی عاشق حسین کو ایک کام یاد آ گیا۔ وہ مجھے تو اپنی شاگرد زہرہ کے ہاں جانا ہے۔ آج اُس سے ملنے کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ نعیم صاحب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو پانچ منٹ لگیں گے۔ اس کا مکان بالکل قریب ہے۔" مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، چنانچہ اُس نے موٹر ایک گلی میں گھیر لی اور اکیلا سامنے والے مکان کی طرف بڑھا۔ میں نے پوچھا "یہ گلی کس طرف ہے؟"

نعیم نے جواب دیا۔ "وادری ہی میں ہے — اُدھر جہاں پارسیوں کے بے شمار مکان ہیں، غالباً اس محلے کو پارسی کالونی کہتے ہیں۔"

—— ہاں تو عاشق حسین موٹر سے نکل کر سامنے کی طرف بڑھا، ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ بغیچہ طے کر کے عاشق حسین نے دروازہ پر دستک دی۔ جب کسی نے دروازہ نہ کھولا تو عاشق نے دوسری بار دستک دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی "کون ہے؟" عاشق حسین نے بلند آواز میں جواب دیا "عاشق" اندر سے آواز آئی "عاشق کی ......" عاشق حسین نے یہ گالی سُن کر ہماری طرف دیکھا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا "دروازہ کھولو .... دروازہ کھولو"

یہ سُن کر میں نے کہا "اس عورت نے شاید عاشق کا غلط مطلب سمجھا، ورنہ جیسا کہ تم ابھی کہہ چکے ہو۔ وہ عاشق کی شاگرد تھی۔"

"خدا جانے بلا کیا تھی اور کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عاشق حسین جھوٹ ہی بولا ہو۔ اور بیئر کی ایک بوتل

پینے کے بعد زہرہ کا خیال اس کے دماغ میں آگیا ہو کسی نے کبھی اس سے کہا ہوگا کہ فلاں نمبر کے فلیٹ میں ایک عورت زہرہ رہتی ہے...... لیکن اس سے کیا بحث ہے۔ عاشق حسین نے اودھم مچانا شروع کر دیا۔ اندر سے گالیاں آتی رہیں اور پیشتر اسکے کہ میں اسے منع کر سکتا تین چار دھکے مار کر اُس نے دروازہ توڑا اور زبردستی اندر داخل ہو گیا جب یہ شور ہوا تو آس پاس کے رہنے والے پارسی اکٹھے ہو گئے میں بیحد پریشان ہوا چنانچہ اسی پریشانی میں موٹر سے باہر نکلا اور عاشق کو باہر لانے کی خاطر اس مکان میں داخل ہو گیا میرے پیچھے پیچھے عاشق کے دونوں ساتھی بھی چلے آئے میں نے اس فلیٹ کے تینوں کمرے دیکھے مگر عاشق نظر نہ آیا نہ اُس کی شاگرد زہرہ۔ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے گھر کی پرلی طرف دوسرا راستہ تھا ممکن ہے وہ اُدھر سے باہر نکل گئے ہوں، وہ اِدھر سے نکل کر موٹر میں بیٹھ گیا وہ پارسی جو گلی میں جمع ہو گئے تھے گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگے میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ بیئر کا سارا نشہ جو دماغ میں تھا اُتر کر میری ٹانگوں میں چلا آیا میرے جی میں آئی کہ عاشق اس کے ساتھیوں اور ان کی موٹر کو روک کر وہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں مگر...... عجیب مشکل میں میری جان پھنس گئی تھی۔ اگر بھاگنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ پارسی جو مجھے چڑیا گھر کا بندر سمجھ کر گھور رہے تھے پکڑ لیتے ـــــ دس بارہ منٹ اسی شش و پنج میں گذرے اس کے بعد عاشق اور اس کے دونوں دوست مکان میں سے باہر نکلے اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ میں نے عاشق سے کوئی بات نہ پوچھی۔ موٹر چلی اور جب دادر کا حلقہ آیا تو میں نے اُس سے کہا "مجھے یہیں اتار دو، بس میں گھر چلا جاؤں گا۔" عاشق کے دماغ سے جوہو کی سیر کا خیال نکل گیا تھا، اُس نے اپنے مارواڑی دوست سے موٹر روکنے کے لئے کہا۔ چنانچہ میں اُن سے رخصت لے کر گھر چلا آیا اور اس واقعہ کو بھول گیا۔"

نعیم نے ایک سگرٹ اور سلگایا اور کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا میں نے پوچھا "اس کے بعد کیا ہوا؟" "مجھے گرفتار کر لیا گیا" نعیم نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا "اس بیوقوف کے بچے عاشق حسین سے جب پولیس والوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ اور کون تھا تو اس نے اپنے مارواڑی دوست، اس موٹر چلانے والے کا اور میرا نام لے دیا ـــــ ہم تینوں ایک گھنٹے کے اندر گرفتار کر لئے گئے۔"

میں نے پوچھا: "یہ کب کی بات ہے — تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟"

نعیم نے جواب دیا: "کل دو ڈھائی بجے کے قریب ہماری گرفتاریاں عمل میں آئیں میں نے تمہیں ٹیلی فون پر ضرور مطلع کیا ہوتا۔ اگر میرے حواس بجا ہوتے۔ بخدا میں سخت پریشان تھا۔ پولیس انسپکٹر ٹیکسی میں ہم سب کو تھانے میں لے گیا۔ وہاں بیانات قلم بند ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ عاشق حسین کے وہ مارواڑی دوست جو کسی کاروبار کے سلسلے میں یہاں آئے تھے زہرہ کا پنکھا اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ بجلی کا یہ پنکھا پولیس نے اُن سے حاصل کر دیا تھا۔"

یہ سُن کر میں نے تشویشناک لہجہ میں کہا: "اس سے تو چوری صاف ثابت ہو گئی ہے"

"چوری ثابت ہوتی ہے تبھی تو میں اسقدر پریشان ہوں اور سچ پوچھو تو اگر یہ ثابت نہ بھی ہوتی تو میری پریشانی اسی قدر رہتی۔ تھانے اور عدالت میں جانا بیحد شرمناک ہے، پر اب کیا کیا جائے جو ہونا ہے ہو چکا ہے اُس خفت سے چھٹکارا نہیں مل سکتا جو مجھے اٹھانا پڑے گی اور اٹھانا پڑ رہی ہے میں بالکل بیگناہ ہوں یعنی ظاہر ہے کہ میں زہرہ کو بالکل نہیں جانتا۔ اس کے مکان پر اگر میں گیا تو محض عاشق حسین کی وجہ سے اُس چند کے کہنے پر ایک بوتل بیئر بھی ہضم نہیں کر سکتا۔"

نعیم کے چہرے پر نفرت اور غصے کے ملے جلے جذبات دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی تھی: "بہت بُرے پھنسے۔"

نعیم نے اُسی انداز میں کہا: "ہنسی! کیا پھنسی اسی کو کہتے ہیں — کل اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے عدالت کا منہ دیکھا اور زہرہ بھی پہلی مرتبہ مجھے نظر آئی۔"

میں نے فوراً ہی پوچھا: "کیسی ہے؟"

نعیم نے بے پروائی سے جواب دیا: "بری نہیں یعنی شکل صورت کے اعتبار سے خاصی ہے۔ بیضوی چہرہ ہے جس پر کیلوں اور مہاسوں کے داغ نظر آتے ہیں۔ لمبے لمبے کالے بال ہیں۔ پیشانی تنگ ہے۔ جوان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حال ہی میں اُس نے یہ دھندا شروع کیا ہے۔"

میں نے بغیر کسی مطلب کے یوں ہی پوچھا "کیا دھندا؟"

نعیم شرما سا گیا "ارے بھئی، وہی جو عورتیں کرتی ہیں۔ زہرہ کے چہرے پر اسکی چھاپ دور سے نظر آسکتی ہے۔ مجھے اس عورت پر اتنا غصہ کبھی نہ آتا مگر جب مجسٹریٹ نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا "تم اسکو پہچانتی ہو؟" تو زہرہ نے میری طرف اپنی بڑی بڑی ڈھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا "ہاں صاحب پہچانتی ہوں۔ اسی نے میری چادر کا کونٹ اٹھایا تھا" جب اس نے یہ جھوٹ بولا تو خدا کی قسم جی میں آئی کہ اسکے حلق میں کہیں سے ایک ڈنڈا نکال کر ٹھونس دوں۔ اتنا بڑا جھوٹ!!"

"اس پر میں نے کہا "یہ بھی جھوٹ تو بولیگی۔ اسکے بغیر کام کیسے چلے گا اسے اپنا کیس مضبوط بھی تو بنانا ہے۔ اب تو تمہیں بہر درویش بر جانِ درویش سب کچھ سننا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے" نعیم نے بڑی پریشانی کے ساتھ کہا "جو کچھ ہوگا اُسے ہر حالت میں سہنا ہی پڑیگا۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ میں کیا بتاؤں میں کسقدر پریشان ہو گیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کسی مرد نے مجھ پر ایسا مقدمہ دائر کیا ہوتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی مگر ذرا غور تو کرو، وہ عورت ہے۔۔۔ اور میں عورتوں کی تعظیم کرتا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

نعیم نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "اِسلئے کہ میں عورتوں کو جانتا ہی نہیں کسی عورت سے ملنے اور اُس سے کھل کر بات چیت کرنیکا مجھے کبھی موقعہ ہی نہیں ملا۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ عورت آئی ہے تو مدعی بن کر۔"

میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ نعیم نے اس پر بگڑ کر کہا "تم ہنستے ہو مگر یہاں میری جان پر بنی ہے دو دن سے میں کمپنی نہیں جا رہا۔ وہاں یہ بات ضرور پہنچ چکی ہو گی سیٹھ صاحب کے سامنے میں کیا منہ لے کے جاؤں گا۔ انہوں نے اگر کچھ پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا؟"

میں نے کہا "جو اصل بات ہے اُن کو بتا دینا۔"

"وہ تو میں بتا ہی دونگا مگر خدا کیلئے سوچو تو سہی کہ میری پوزیشن کیا ہے۔ میں سیٹھ صاحب کی بیحد عزت کرتا ہوں اِسلئے کہ وہ میرے آقا ہیں، اگر انہوں نے مجھے بدکردار سمجھ کر برطرف کر دیا تو عمر بھر کے لئے میں داغدار ہو جاؤنگا۔ ملازمت کھونے کا مجھے اتنا افسوس نہیں ہوگا مگر یہاں سوال

عزت دنا ہوں کہ ہے۔ وہ ضرور بدگمان ہو جائیںگے میں انکی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں، میری سچی باتوں کو بھی وہ جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ فلم کمپنی میں ہر شخص جھوٹ بولتا ہے وہ خود بھی ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں — اب میں کیا کروں… کچھ سمجھ میں نہیں آتا!"

میں نے ہر ممکن طریقے سے نعیم کی اخلاقی جرأت بڑھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا وہ بیحد ڈرپوک ہے خاص کر عورتوں کے معاملے میں تو اسکی بزدلی بہت ہی زیادہ ہے۔ دراصل معاملہ بھی سنگین تھا، اگر بیتی پیچھا برآمد نہ ہوتا تو کیس بالکل معمولی رہ جاتا۔ مگر پولس اس مار دھاڑی سے پنکھا حاصل کر چکی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ زہرہ ایک حد تک سچی تھی۔

نعیم زیادہ دیر تک میرے پاس نہ ٹھہرا اور چلا گیا۔ دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ اس کی پریشانی اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ آتے ہی کہنے لگا "بھائی ایک مصیبت میں تو جان پھنسی تھی۔ اب ایک اور آفت گلے پڑ گئی ہے!"

میں نے تشویش کے ساتھ کہا "کیا ہوا! — کیا کوئی اور کیس کھڑا ہو گیا!"

"نہیں، کیس وہی ہے مگر ایک ایسی بات ہوئی ہے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی" نعیم نے کرسی پر بیٹھ کر اضطراب کیساتھ ٹانگ ہلانا شروع کی "آج صبح سیٹھ صاحب نے مجھے بلانے کیلئے موٹر بھیجی مجھے جانا ہی پڑا حالانکہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ کبھی نہیں جاؤں گا۔ بہرحال فلم کمپنی میں داخل ہوتے وقت میری حالت وہی تھی جو احساس ملزم کی ہوتی ہے شرم کے مارے میرا حلق سوکھ رہا تھا، سر بھاری ہو گیا تھا۔ نیچی نظریں کئے سیٹھ صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے تپاک کے ساتھ انہوں نے پہلی مرتبہ میرے ساتھ ہینڈ شیک کیا اور ہنس کر کہنے لگے "منشی صاحب! آپ نے کمال کر دیا۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ بیٹھئے تشریف رکھئے!" میں ندامت میں غرق کرسی پر بیٹھ گیا وہ بھی بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے ایسی باتیں شروع کیں کہ میرے اوسان خطا ہو گئے کہنے لگے "آپ گھبراتے کیوں ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بتایئے کہ زہرہ ہے کیسی؟ کچھ اچھی ہے؟ بھئی آپ نے تو کمال کر دیا۔ میں سنتا ہوں کہ آپ نے پی کر وہ دھمال مچائی کہ پارسی کالونی کے سب آدمی اکٹھے ہو گئے کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ زہرہ کی ساڑھی اتار کر لے گئے۔

پہلے بھی تو آپ اُس کے ہاں آتے جاتے ہونگے، پھر حرامزادی نے پولس میں رپورٹ کیوں لکھوائی، پر کیا پتہ ہے آپ نے بہت زیادہ شرارتیں کی ہوں"۔ ایسی ہی بے شمار باتیں انھوں نے مجھ سے کیں۔ میں خاموش رہا۔ اس کے بعد انہوں نے چار منگوائی ایک پیالہ میرے لئے بنایا۔ اور پھر وہی گفتگو شروع کر دی: "چاندی کا ٹی سٹ جو آپ اٹھا کر لے گئے تھے مجھے اگر آپ پریزنٹ کر دیں تو میں ابھی آپکو اپنے وکیل کے پاس لے چلتا ہوں۔ ویسی اچھی وکالت کریگا کہ زہرہ کی طبیعت صاف ہو جائیگی میں سمجھتا ہوں زہرہ شکل و صورت کی اچھی ہے، تو بھی اس مقدمہ کے بعد اُسے لے آؤ نا۔ اپنے فلم میں اُسے کوئی چھوٹا سا رول دے دینگے... اور ہاں، یہ آپ نے اچھا کیا کہ اسی کی شراب پی اور اسی کی چیزیں اڑا کر لے گئے! ——پر آپ ایک درجن آدمی اپنے ساتھ کیوں لے گئے تھے؟ بیچاری اتنے آدمی دیکھ کر گھبرا گئی"۔ بات بات پر وہ ہنستے تھے جیسے گفتگو کے لئے انہیں ایک نہایت ہی دلچسپ موضوع مل گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس سے پہلے انھوں نے کبھی میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

میں نے کہا: "تو کیا ہوا۔ تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ وہ تم پر ناراض نہ ہوئے"۔

نعیم بگڑ کر کہنے لگا: "یہ بھی تم نے خوب کہا کہ مجھے خوش ہونا چاہیے، وہ مجھے مجرم سمجھ رہے تھے جو کہ میں نہیں ہوں......" میں کیا کہہ سکتا تھا۔ خاموش رہا۔ "تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے خزانچی کو بلایا اور مجھے سو روپے ایڈوانس دلوائے حالانکہ دو مہینے سے کسی ملازم کو تنخواہ نہیں مل رہی"۔

میں نے کہا: "تو کیا بُرا ہوا؟"

"ارے بھئی تم ساری بات تو سُن لو" نعیم چیخ گیا۔ "سو روپے دلوا کر انہوں نے کہا: "یہ آپ اپنے پاس رکھیئے، آپ کو مقدمہ کے لیئے ضرورت ہو گی۔ وکیل کا بندوبست میں ابھی کیئے دیتا ہوں"۔ ٹیلی فون پر انہوں نے فوراً ہی وکیل سے بات کی۔ پھر مجھے اپنی موٹر میں بیٹھا کر اُس کے پاس لے گئے۔ ساری باتیں اس کو سمجھائیں اور کہا۔ دیکھیئے اس مقدمہ میں جان لڑا دیجیئے گا۔ بات بالکل معمولی ہے، اس لیئے کہ منشی صاحب سے زہرہ کے تعلقات بہت پرانے ہیں"...... میں کیا کہتا۔ وہاں بھی

خاموش رہا۔"

میں نے ہنس کر نعیم سے کہا۔" اب بھی خاموش رہو۔ تمہارا کیا بگڑ گیا؟"

نعیم اٹھ کھڑا ہوا اور اضطراب کے ساتھ ٹہلنے لگا۔" ابھی کچھ بگڑا ہی نہیں عدالت میں مجھے بیان دینا پڑے گا کہ زہرہ میری داشتہ ہے اور میں اُسے ایک مدّت سے جانتا ہوں — اور...... اور...... سیٹھ صاحب نے آج شام مجھے مدعو کیا ہے۔ کہتے تھے گرین چلیں گے۔ وہاں کچھ شغل رہے گا...... میری جان عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہے — سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو رہا ہے......"

ختم شد

GOVT. GIRLS COLLEGE
ACC. No. 4786
LIBRARY